

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_188601

UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

928.

92859143

Call No. 44A 44A

Accession No.

141411
M. 16268.

Author

Title

This book should be returned on or before the date
last marked below.

پرسم چند

ہنسراج زہر

OSM UNIVERSITY LIBRARY

۱۶۲۶۸

نقش اول ایک ہزار

اکتوبر سن ۱۹۹۷ء

قیمت : تین روپے بارہ آنے

مطبوعہ :- نعمانی پریس دہلی

نیادور پبلشرز - اکبر سنزل، اردو بازار، دہلی

پریم چند کے لڑکے

اپنے دوست

امرت رائے
کے
نام

مصنف کی دوسری کتابیں

نیا افق - افسانے

تارو - ناول

ھنری

دھرتی کی بیٹی - ناول

اُپ ہاس - کہانیاں

نوکشج - کہانیاں

ترتیب

- ۹ (۱) اپنی بات
- ۱۱ (۲) پیش لفظ سیداعتماد حسین
- ۱۹ (۳) بچپن
- ۳۱ (۴) سکول
- ۴۱ (۵) درس گاہ
- ۵۶ (۶) سکول ماسٹر
- ۶۵ (۷) پہلی تخلیق
- ۷۷ (۸) کانپور میں
- ۸۷ (۹) بمبوق

۱۰۴	(۱۰) سوزِ وطن
۱۱۴	(۱۱) نیا بیاہ
۱۳۰	(۱۲) استغفا
۱۴۸	(۱۳) گھر میں
۱۶۳	(۱۴) پبلشر
۱۷۷	(۱۵) پریس
۱۸۷	(۱۶) ایڈیٹر
۲۰۴	(۱۷) سرمایہ ترا
۲۱۷	(۱۸) منسلک
۲۲۸	(۱۹) صدارت
۲۱۲	(۲۰) عمل
۲۵۶	(۲۱) آرٹ
۲۷۲	(۲۲) شہرت

ضمیمہ

- (۱) خطبہ صدارت پریم چند
 (۲) میں افسانہ کیسے لکھتا ہوں ۳۰۵

اپنی بات

بیس بائیس سال پہلے کا ذکر ہے میں ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ ہمارے سکول میں ماہنامہ مخزن (لاہور) آتا تھا۔ میں نے اس میں ”منتر“ کہانی پڑھی، اس کہانی کا ہیرو۔ بوڑھا بھگت۔ اپنی بے لوث خدمت اور نیک فطرت کے باعث مجھے اتنا پسند آیا کہ وہ انسانی عظمت کا ایک امٹ نقش میرے ذہن پر چھوڑ گیا۔

ادریوں اس کہانی کے مصنف پریم چند سے میں پہلی مرتبہ متعارف ہوا۔

پھر۔ پریم چند کی کوئی بھی چیز۔ کہانی یا کتاب۔ ملتی تھی میں اسے شوق سے پڑھتا تھا۔ کالج کے زمانے ہی میں نے لگ بھگ ان کی تمام مطبوعہ چیزیں پڑھ ڈالیں، اور جتنا پڑھتا تھا اتنا ہی انھیں دیکھنے کا اشتیاق بڑھتا تھا۔ خوش قسمتی سے اپریل ۱۹۳۷ء میں وہ آریہ سماج کے سامانہ جلسے کے ایک اجلاس کی صدارت کرنے لاہور آئے، ان میں انھیں دیکھنے گیا۔ سوچا تھا کہ افسانہ نگاری کے فن پر ان سے کچھ

گفتگو کروں گا۔ لیکن صرف عقیدہ سے دیکھتا ہی رہا کچھ کہتے نہ بن پڑا۔

اس کے بعد ہمارے ادب کی تاریخ میں ایک دور ایسا آیا جب جنس نگاری اور تحلیل نفسی کا نام ترقی پسندی تھا اور کہا جاتا تھا کہ پریم چند سے ہمارا افسانہ بہت آگے بڑھ گیا ہے، نئے ادیبوں کی اس تحریک سے میں بھی بہت حد تک متاثر ہوا۔

مگر بھول جلد مدھر گئی۔ جنگ اور بعد کے واقعات کے باعث جمود لوٹا اور طبقاتی شعور بڑھا تو لوگوں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ ترقی پسندی کا مطالبہ تجزیہ نفس اور اجتہاد نہیں بلکہ کچھ اور ہے۔ اس ضمن میں ہمیں پریم چند سے بہت کچھ سیکھنا باقی ہے، چنانچہ میرے دل میں پریم چند کو پھر سے پڑھنے اور ان پر کچھ لکھنے کی خواہش پیدا ہوئی دوڑھائی سال کی محنت کے بعد اپنی یہ کتاب پیش کرتے ہوئے میں خوشی محسوس کر رہا ہوں، کیونکہ مجھے اس کی افادیت کا یقین ہے۔ اسے لکھتے وقت جو مقصد میرے پیش نظر تھا سید احتشام حسین نے ”پیش لفظ“ میں اس کی اچھی طرح وضاحت کر دی ہے۔

سید احتشام حسین کے علاوہ مجھے اپنے دو ساتھیوں جنی لال آئند اور شایام سندر کا شکریہ ادا کرنا ہے، جنہوں نے متعلقہ ٹریجر ہم پہنچا کر میری اعانت کی

ہنسراج رہبر

پیش لفظ

اُدو کے ادیبوں اور نقادوں نے پریم چند کو نہ تو کھلے دل سے خراج عقیدت ہی پیش کیا ہو اور نہ پرکھنے والی نگاہ سے ابھی تک ان پر تنقیدی نظر ہی ڈالی ہو، اس سے پریم چند کو نہیں سمجھو دُور کے ادیبوں کو خود نقصان پہنچ رہا ہو کیونکہ ہم سے پہلے کے اچھے ادیبوں اور اپنے زمانے کو متاثر کرنے والے مفکروں نے جس طرح اپنے عہد کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی اُس کی روشنی میں ہم کہیں ان کی خامیوں سے بچ کر اور کہیں ان کے شعور اور اسلوب سے فائدہ اٹھا کر اپنے عہد کی آویزشوں کو سمجھ اور سمجھا سکتے ہیں۔ اس لیے پریم چند کی زندگی اور ادبی کارناموں کا مطالعہ ہندوستان کی موجودہ

ادبی تحریکوں کو سمجھنے اور انہیں آگے بڑھانے میں مدد دے سکتا ہے بشرطیکہ وہ مطالعہ زندگی اور ادب کے سماجی اور طبقاتی تعلق کو پیش نظر رکھ کر کیا گیا ہو۔ پریم چند پر مہنسراج رتہبرگی یہ کتاب ایک ایسے ہی مطالعہ کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کمی کو ایک حد تک پورا کرتی ہے۔ پریم چند افسانوی ادب کا ایک عہد اور ایک روایت تھے۔

تفیدی نگاہ سے دیکھا جائے تو اردو افسانے میں سماجی حقیقت پسندی کا آغاز انہیں کے افسانوں سے ہوتا ہے، یہ حقیقت پسندی انسان دوستی اور جانب داری کا رنگ لے لیے ہوئے ہے، اس کا ایک سماجی مقصد ہے جسے شریعہ میں پریم چند نے اصلاحی رنگ دے کر آدرش اور مثالیت کے روپ میں پیش کیا تھا لیکن اپنی زندگی کے آخری دور میں ادب اور زندگی کے تعلق کو سمجھ کر انہوں نے اس ادب کی مذمت کی جو غوام کی خدمت کے جذبے سے سرشار نہ ہو اور جو حرکت اور بے چینی پیدا نہ کرے۔ پریم چند کا یہ ذہنی ارتقا مطالعہ کا اہم موضوع ہے لیکن آج اس مطالعہ کی نوعیت کیا ہو؟ اس سوال کے جواب پر صرف پریم چند ہی کا نہیں، ماضی کے سارے ادیبوں کا مطالعہ منحصر ہے۔

یوں تو پریم چند نے مضامین بھی لکھے ہیں اور ڈرامے بھی لیکن اردو ادب کے دو شعبے خاص طور سے ان کے قلم کے رہن منت ہیں۔ مختصر افسانہ اور ناول۔ ان دونوں اصناف کا مطالعہ فن اور موضوع کے لحاظ سے کیا جائے تو پریم چند کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے (کہانیوں کا

موضوع بادشاہوں، شہزادیوں، جنوں اور پریوں سے نیچے اتر کر خاص قسم کے انسانوں تک پہنچ گیا تھا لیکن یہ پریم چند ہی کا کام تھا کہ انہوں نے محنت کش عوام کو اپنے افسانوں اور ناولوں کا ہیرو بنایا، اور اس دنیا کی تصویر کھینچی جو سب سے زیادہ جان دار اور سب سے زیادہ حقیقی اور سب سے زیادہ انسان دوستی کی منظر تھی۔ یہی نہیں میرا تو یہ بھی خیال ہے کہ اُردو اور ہندی میں پریم چند پہلے ادیب ہیں جنہوں نے شعوری طور پر ادیب کے ذریعے عوام کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش میں انسان دوستی کی طرف یہ قدم اٹھایا۔ یہ پریم چند کے انفرادی شعور کی بات نہیں ہے، نہ صرف یہ کہنے سے کام چل سکتا ہے کہ وہ انگریزی، فرانسیسی، روسی اور بنگالی ناول نویسوں سے متاثر ہوئے بلکہ اس کی جھلکتوں طبقوں کے بدلتے ہوئے مزاج میں کی جانی چاہیے جس میں وہ پیدا ہوئے اور جس کے ساتھ ان کی ہمدردیاں تھیں، بیسویں صدی کے اس ہندوستان کو دیکھنا چاہیے جو ایک غیر ملکی حکومت کے خلاف آزادی کی جدوجہد کر رہا تھا اور جس کی رہنمائی، اعلیٰ اور متوسط طبقے کے ذہین محب وطن کر رہے تھے اور اس ہندوستانی سماج پر نظر ڈالنا چاہیے جس میں معاشی حالات کے ماتحت طبقاتی کشمکش بھی تیز ہوتی جا رہی تھی مگر متوسط طبقہ اس کے مذہبی اور تہذیبی رُخ پر نگاہ جمائے ہوئے تھا۔ اس ہندوستان میں پریم چند بنارس کے ایک دیہات میں پیدا ہوئے، وہ گاؤں کی زندگی سے واقف ہی نہ تھے اس سے جذباتی

اور ہمدردانہ تعلق بھی رکھتے تھے ، اُن کا گھر ایک نچلے متوسط طبقے کا گھر تھا۔ حالات ایسے تھے کہ بچپن ہی سے انھیں اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ پالنے کے لیے میدانِ عمل میں اترنا اور زمانے کے اونچ نیچ کو دیکھنا پڑا۔ اس لیے پریم چند اپنے حدود کے اندر زندگی کے مسائل کو نیم اصلاحی اور نیم انقلابی نقطہ نظر ہی سے دیکھ سکتے تھے۔ لیکن ان کی بڑائی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے ادبی سفر میں کسی ایسی جگہ قیام نہیں کیا جہاں سے ترقی کا راستہ بند ہو جاتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ وقت کے تقاضوں کا ساتھ دینے کی برابر کوشش کرتے رہے اور بدلے ہوئے حقائق کا ادراک کرتے رہنے کی وجہ سے کبھی ادب محض کی بھول بھلیتوں میں گرفتار نہیں ہوئے۔ موندوں اور مواد کے لیے انھوں نے اسی زندگی کو منتخب کیا جسے وہ اچھی طرح جانتے تھے اور وہی تصویر بنائیں جن کے کھینچنے میں ان کا موقلم کم سے کم غلطی کر سکتا تھا۔ پریم چند کی کامیابی کا راز ہے زندگی سے ان کی ذاتی واقفیت و رعام انسان سے محبت۔

ہنسراج رہبر نے پریم چند کا مطالعہ اسی نقطہ نظر سے کیا ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے تو اس فضا کو ڈھونڈ نکالا ہے جس میں پریم چند پیدا ہوئے ، پلے اور بڑھے اور جس کی کشمکش میں ان کی ذہنی نشوونما ہوئی اس کے بعد انھوں نے خود پریم چند کی زندگی کا عکس ان کے افسانوں اور ناولوں میں تلاش کیا ہے اسی طرح پریم چند کی حقیقت نگاری

کو ان خارجی حالات کا عکس بنانے کی کوشش کی ہو جن سے اُن کے ماحول کی تخلیق ہوئی تھی۔ یہ طریق کار نیا بھی ہو اور دل چسپ بھی لیکن بعض اوقات اس میں غلطی کا امکان بھی ہو کیونکہ افسانوں اور ناولوں میں بیان کئے ہوئے واقعات اس وقت تک محض داخلی شہادتوں کی حیثیت رکھتے ہیں جب تک قطعی طور پر ہمیں اس کا علم نہ ہو کہ یہ واقعات خود مصنف کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ افسانہ نگار اپنے تخیل کی مدد سے، افسانوی ضروریات کو مد نظر رکھ کر، واقعات کو اس طرح بھی ترتیب دے سکتا ہو کہ وہ خود اس کی زندگی سے کوئی تعلق نہ رکھتے ہوں، ایسی صورت میں چند ظاہری مشابہتوں کی بنا پر یہ نتیجہ نکالنا کہ یہ خود اس کی زندگی کے واقعات ہوں گے غلط فہمی بھی پیدا کر سکتا ہو۔ ظاہر ہے کہ ناول نویس اور افسانہ نگار اپنے خیالات کا اظہار مختلف کرداروں ہی کے ذریعے سے کرتا ہو، ان کرداروں میں سے بعض سے وہ ایسی باتیں کہلاتا اور ایسے عمل کراتا ہو جنہیں وہ خود پسند کرتا ہو اور بعض کرداروں سے ایسی باتیں کہلاتا ہو جنہیں وہ صحیح نہیں سمجھتا۔ یہ دونوں شکلیں کہانی کے تانے بانے میں گتھی ہوئی ہوتی ہیں اور صرف تنقیدی صلاحیت رکھنے والی آنکھ مصنف کے اصل مقصد کا پتہ لگا سکتی ہے ایسا ادیب جو کوئی فلسفہ زندگی نہ رکھتا ہو یا اپنے خیالات پر پردہ ڈالنے کے لیے ناکام ہی طور پر سہی، یہ کہتا ہو کہ اس کے کرداروں میں سے کوئی بھی اس کے خیالوں کا ترجمان نہیں، اس کے یہاں تو

یہ وقت پیش آسکتی ہو (حالات کہ نقاد کی نگاہ سے چھپ نہیں سکتی) لیکن نیکی اور بدی کے معاملے میں، سماج کی اچھائی اور برائی کے معاملے میں ہر اچھے ادیب کا نقطہ نظر اس کے کرداروں ہی کی بات چیت اور ہرکات و سکنات سے ظاہر ہو جاتا ہے اس لیے رہبر کی یہ خواہش عبث نہیں کہ وہ پریم چند کی زندگی کی کہانی خود ان کی کہانیوں میں تلاش کریں اور ان کے خیالات کے نشیب و فراز ان کے کرداروں کے خیالات کے نشیب و فراز میں ڈھونڈیں، مگر جہاں تک سوانح حیات کا تعلق ہے اس میں کافی جہان بین کی ضرورت ہوگی۔ رہبر نے حتی الوسع غلطی کے امکانات سے بچنے کے لئے پریم چند کی زندگی کے انہیں واقعات کو کہانیوں پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے جو خود انہوں نے، محترمہ شیورانی دیوی نے یا کسی اور واقفکار نے لکھے ہیں یا عام طور پر معلوم ہیں۔ اس احتیاط پسندی کی وجہ سے پریم چند کی زندگی اور افسانوی حقائق کم و بیش بڑی خوبی کے ساتھ منطبق ہو گئے ہیں اور رہبر اپنی اس مخصوص کاوش میں بڑی حد تک کامیاب ہیں۔

زندگی کے مقابلے میں رہبر نے پریم چند کے فن پر بہت کم لکھا ہے اور شاید انہوں نے ایسا جان بوجھ کر کیا ہے تاہم کتاب کے آخری دو ابواب میں پریم چند کے ادبی مقدمات کا تجزیہ بڑی خوبی سے کیا گیا ہے۔ پریم چند ادب میں کیا چاہتے تھے، ادیب سے کس بات

کی توقع رکھتے تھے، حقیقت کے متعلق ان کا کیا خیال تھا، ادب اور زندگی کے تعلق کے بارے میں وہ کیا رائے رکھتے تھے، جب تک یہ باتیں سمجھ میں نہ آجائیں یہ بھی نہیں سمجھا جاسکتا کہ ہندوستان کی جنگ آزادی اور طبقاتی کشمکش کے متعلق پریم چند کا رویہ کیا تھا۔ رہبر نے دونوں کی حدوں کو نمایاں کرنے میں بڑی اچھی تنقیدی صلاحیت کا ثبوت دیا ہے۔ پریم چند کے فن میں جو ترقی پسند رجحانات ہیں ان کو ان کی طبقاتی کمزوریوں سے الگ کر کے دیکھنا ہی پریم چند کی سچی ادبی عظمت کو نمایاں کر سکتا ہے اور موجودہ دور کے ادیب اس روایت کو برقرار رکھنے اور ترقی دینے کے لیے یہی کر سکتے ہیں کہ پریم چند کی زندگی اور تصنیفات کی روشنی میں اس تضاد سے بچنے کی کوشش کریں جس کا شکار اپنی عظمت کے باوجود وہ بعض اوقات ہو جاتے تھے۔ پریم چند نے جس طرح ہندوستانی عوام کی زندگی کو سمجھا جس طرح ان کی خواہشوں اور خوابوں کو پیش کیا اور جس طرح عوام کے اندر سوئی اور کچلی ہوئی انسانیت کو جگانے کی کوشش کی ہے اس سے آج کے ادیب نہ صرف سبق لے سکتے ہیں بلکہ اپنی تخلیقات میں زندگی اور توانائی کی روح بھونک سکتے ہیں۔

اگر میں نے رہبر کے اس مطالعہ کو سمجھنے میں غلطی نہیں کی ہے تو میرا خیال ہے کہ انھوں نے بھی یہ کتاب لکھ کر اسی اہم بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ افسانہ نگار رہبر کی یہ پہلی تنقیدی

اور علمی کاوش مقبول ہوگی اور پریم چند کے سمجھنے میں معاون
ثابت ہوگی۔

سید احتشام حسین

لکھنؤ یونیورسٹی
یکم مارچ ۱۹۵۷ء

کشتیوں میں بیٹھ کر پارگل جاتا۔ گالیوں میں مزہ آتا تھا۔ اسے بینڈ باجا بہت پسند تھا۔ بینڈ کا کوئی دن ناغہ نہ کرتا تھا۔۔۔“

ممکن ہے اس میں کچھ مبالغہ ہو پھر بھی اس میں پریم چند کے اپنے لڑکپن کی تصویر نظر آتی ہے کیونکہ وہی گاؤں کا ماحول ہے۔ درخت ہیں۔ اور دریا کا کنارہ ہے۔ ہر دو اقتباسات سے یہ بھی ظاہر ہے کہ دھنپت رائے کو مدرسہ سے، مولوی سے اور کتابوں سے کوئی خاص انس نہیں تھا۔ وہ مدرسہ کی ”طوطا رشت“ سے کھلی فضا میں گھومنا گایاں کھانا اور بینڈ سننا زیادہ پسند کرتے تھے۔ اپنے اس جذبہ کو آئندہ تجربہ کی روشنی میں انھوں نے ”تحریک کہانی“ میں بہت اچھی طرح پیش کیا ہے۔

”نیم تعلیم یافتہ فاقہ کش مدرسوں سے آپ یہ امید نہیں کر سکتے کہ وہ کوئی۔ اونچا معیار پیش نظر رکھ سکیں، زیادہ سے زیادہ اتنا ہی ہو گا کہ چار پانچ سال میں لڑکا حرف شناس ہو جائے گا۔ میں اسے ”کوہ کنڈن وکاہ آبردن“ کے مصداق سمجھتا ہوں۔ سن شعور میں یہ مرحلہ ایک ہینہ میں آسانی سے طے کیا جاسکتا ہے جس تجربہ سے کہہ سکتا ہوں کہ اٹھارہ بیس سال کی عمر میں جتنا ہم ایک۔۔۔ ہینہ میں پڑھ سکتے ہیں۔ اتنا چھ سات سال کی عمر میں تین سال میں بھی نہیں پڑھ سکتے۔ خواہ مخواہ بچوں کو مدرسہ میں قید کرانے سے فائدہ ہوں چاہے اسے روٹیاں نہ ملتیں مگر تازہ ہوا تو ملتی۔ فطرت سے تجربات تو حاصل کرتا۔ مدرسہ میں بند کر کے تو آپ اسے ذہنی اور جسمانی دونوں ترقیوں سے ہی محروم کر دیتے ہیں۔۔۔“

انگریزی عملداری کے بعد بھی گاؤں میں جاگیردارانہ ڈھنگ کے مدرسے قائم تھے جنھیں نیم تعلیم یافتہ نکلے اور کامل الوجود مولوی چلاتے تھے نہ ان کے پاس کوئی

رجسٹر ہوتا تھا اور نہ انھیں بچوں کی ذہنی نشوونما سے کوئی علاقہ تھا۔ وہ قاعدہ اور سپارے رٹاتے تھے اگر کوئی بچہ رٹ کرنے آتا تھا تو پیٹتے تھے۔ وہ تعلیم کو تخلیقی قوتوں کو سیدار کرنے اور نشوونما دینے کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک مذہبی فریضہ سمجھتے تھے۔ تعلیم کا یہ کپکانکی ڈھنگ بچے کو اپنے ارتقا پسند شعور پر حیرت محسوس ہوتا ہے۔ ایسے میں مدرسے اور کتابوں سے نفرت ہو جانا لازمی امر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حساس دھنپت رائے مدرسہ سے ہفتوں غائب رہتے تھے اور کھیتوں اور باغوں میں گھوم کر فطرت سے تجربات حاصل کرتے تھے۔ سپاہیوں کی قواعد دیکھتے اور بینہ سنستے تھے اس آوارگی میں ان کا چچا زاد بھائی بھی ان کے ساتھ شریک ہوتا تھا۔ جو عمر میں ان سے بڑا تھا۔ ایک مرتبہ انھوں نے گھر سے چچا کا ایک روپیہ چرایا اور دریائے کنارے بیٹھ کر مٹھائی اور پھل کھائے بعد میں چوری کا علم ہو گیا۔ اسی لئے چچا زاد بھائی کی خوب مرمت ہوئی اس اثناء میں منشی عجائب لال کی ترقی ہو گئی اور انھیں ڈاک منشی بنا کر گورکھپور بھیج دیا گیا۔ دھنپت رائے بھی باپ کے ساتھ گاؤں سے شہر میں آ گئے اور اب وہ مدرسہ کی بجائے سکول میں داخل ہوئے گو سکولوں میں بھی بچوں کی نشوونما کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ کیونکہ انگریزوں کا مقصد بھی ہندوستانیوں کو تعلیم یافتہ بنانا نہیں بلکہ اپنی دفتری حکومت کے لئے کلرک پیدا کرنا تھا اور ان کے بعد کانگریس راج میر بھی وہی سسٹم جاری ہے۔ لیکن بہر کیف۔ سکول مدرسہ سے بہتر تھا۔ یہاں پریم چند۔ سچ مچ پڑھنے کی طرف مائل ہوتے۔

رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری نے ایک مضمون بعنوان ”پریم چند“ لکھا ہے جس میں ان کی گورکھپور کی سکول کی زندگی کو یوں بیان کیا ہے۔

”اس طبقہ کے دوسرے لڑکوں کی طرح پریم چند بھی ایک ہائی سکول میں داخل ہو گئے۔ اور ان کی تعلیم ابتدائی درجوں کو چھوڑ کر گورکھپور کے ایک سکول میں شروع ہو گئی جہاں ان کے والد ملازم تھے۔ پریم چند نے مجھ سے بتایا کہ لڑکپن میں ان کی دوستی اپنے درجہ کے ایک لڑکے سے ہو گئی جو ایک تبا کو فروش کا بیٹا تھا روزانہ وہ اپنے کم عمر دوست کے ساتھ اسکول کے بعد اس کے مکان پر جاتے تھے۔ وہاں تبا کو کے بڑے بڑے سیاہ پنڈروں کے پیچھے تبا کو فروش اور اس کے احباب بیٹھ کر برابر حقہ پیتے اور طلسم ہوش پڑھتے تھے۔۔۔۔۔۔ یہاں پریم چند اپنے کمسن دوست کے ساتھ بیٹھ کر طلسم ہوش پڑھنے کے افسانے سنتے تھے یہاں تک کے شام ہو جاتی جب وہ اپنے گھر چلے جاتے یہ سلسلہ تقریباً ایک سال جاری رہا۔ لیکن اس اثنا میں پریم چند ہمیشہ کے لئے رومانی کہانیوں میں ڈوب گئے۔ درحقیقت ان قصوں اور کہانیوں کو جس دلچسپی اور اشتیاق سے انھوں نے سنا تھا اس سے ان کے قوت بیان میں روانی اور وضاحت کے انداز جذب ہو گئے اور ان لذیذ حکایتوں کی روح ان میں تحلیل ہو گئی کچھ دنوں کے بعد یہی قوتیں۔۔۔۔۔۔ پریم چند کی تصانیف میں کس حسن سے پھلی بھولیں۔“

راجا رانی اور پریوں کے شہزادے کی کہانیاں سننے والی ماں مدت ہوئی مرچکی تھی اور گاؤں کا کھلا ماحول بھی نہیں تھا۔ لیکن زندگی کی تلخیاں بڑھ گئی تھیں اب انھیں جھوٹے برتن ہی نہیں مانجنا ہوتے تھے۔ سو تیلی ماں کے بچے کو کھانا بھی ہوتا تھا بچے کو کھانا کتاب پڑھنے سے کم رومان انگیز نہیں۔ لیکن تبھی نا جب اسے اپنی مرضی اور شوق سے کھلایا جائے۔ لیکن سو تیلی ماں انھیں اپنا غلام سمجھ کر دھونس سے کام لیتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے دل میں ماں کی طرف سے روز بروز مغارت بڑھتی جاتی

تھی اور وہ طلسم ہوشربا میں گھر کی تلخیوں کا بدل ڈھونڈتے تھے۔ جو انھیں اس کہانی کے رومان میں مل جاتا تھا۔ یعنی وہ تبا کو کی دوکان پر کتاب ہی نہیں سنتے تھے اپنے غم کا مداوا بھی کرتے تھے۔ شاید اسی لئے انھوں نے جلد اس راز کو ہالیا کہ ادیب بننا بنی نوع انسان کی خدمت کرنا ہے۔

”طلسم ہوشربا“ سننے کے بعد انھیں کہانیوں اور کتابوں سے از حد دلچسپی ہو گئی انھوں نے اپنی اس دلچسپی کا ذکر ”میری پہلی تخلیق“ میں نہایت وضاحت سے کیا ہے، لکھتے ہیں:۔

”اس وقت میری عمر کوئی تیرہ سال ہو گئی۔ ہندی بالکل نہ جانتا تھا۔ اردو کے ناول پڑھنے کا جنون تھا۔ مولانا ستر، پنڈت رتن ناتھ سرشار، مرزا اسد اللہ علی ہر دوئی تو اسی اس وقت کے مقبول ترین ناول نویس تھے، ان کی چیزیں یہاں مل جاتی تھیں۔ سکول کی یاد بھول جاتی تھی۔ کتاب ختم کر کے ہی دم لیتا تھا۔ اس زمانہ میں ریٹالڈ کے ناولوں کی دھوم تھی۔ اردو میں ان کے ترجمے دنگر ادھر تک رہے تھے۔ اور ہاتھوں ہاتھ بکتے تھے۔ میں بھی ان کا عاشق تھا۔ اور پنڈت رتن ناتھ سرشار سے تو سیری نہ ہوتی تھی۔ ان کی تمام کتابیں میں نے پڑھ ڈالیں۔ ان دنوں میرے تبا جی گورکھپور میں رہتے تھے اور میں بھی گورکھپور کے سکول میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ جو تیسرا درجہ کہلاتا تھا۔ ریتی پر ایک کتب فروش بڑی لال رہتا تھا میں اس کی دوکان پر جا بیٹھتا تھا۔ اس کے سٹاک سے ناول لے لے کر پڑھتا تھا۔ مگر دوکان پر سارے دن تو بیٹھ نہ سکتا تھا۔ اس لئے میں اس کی دوکان سے انگریزی کتبوں کی کچیاں اور خطا لے کر اپنے سکول کے لڑکوں کے ہاتھ بیچا کرتا تھا اور اس کے معاوضہ میں ناول دوکان

سے گھر لاکر پڑھنا تھا۔ اور تین برسوں میں میں نے سیکڑوں ہی ناول پڑھ ڈالے ہوں گے۔ جب ناولوں کا شاک ختم ہو گیا تو میں نے ناول کشور پریس سے نکلے ہوئے پرائز کے اردو ترجمے بھی پڑھے اور ”طلم ہو شر با“ کے کئی حصے بھی پڑھے۔ اس عظیم طلسمی کتاب کے ۱۷ حصے اس وقت نکل چکے تھے۔ اور ایک ایک حصہ بڑے سپرائز کی شکل میں دو دو مزار صفحات سے کم نہ ہو گا اور ان ۱۷ حصوں کے بعد اس کتاب کے مختلف موضوعات پر یکیسوں حصے چھپ چکے تھے۔ ان میں سے کئی میں نے کئی پڑھے۔ جس نے اتنے بڑے گنتھ کی تخلیق کی اس کی قوت تخیل کس قدر زوردار ہوگی اس کا صرف قیاس ہی کیا جاسکتا ہے، کہتے ہیں یہ کہانیاں مولانا فیضی نے اکبر کی تفریح طبع کے لئے فارسی میں لکھی تھیں۔ اس میں کس قدر صداقت ہے کہہ نہیں سکتا۔ لیکن اتنی طویل کہانی نشا ہی دنیا کی کسی زبان میں ہو۔ پوری انسائیکلو پیڈیا سمجھ لیجئے۔ ایک آدمی نو اپنی ساٹھ برس کی عمر میں نقل کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا۔ تخلیق تو دوسری بات ہے۔

لیکن پڑھتے وقت دھنپت رائے ضرور سوچتے ہوئے کہیں بھی کوئی ایسی ہی سرگم خیز تخلیق کروں اور اس خواہش سے ان کے تخیل کو جلا ملتی رہی۔

لیکن وہ صرف قصبے کہانیاں ہی نہیں پڑھتے تھے۔ امتحان پاس کرنے کے لئے سکول کی کتابوں پر بھی وقت صرف کرتے تھے لیکن ان کتابوں سے پیشتر دوسرے لڑکوں کی طرح انھیں چنداں رغبت نہیں تھی طبیعت پر جبر کر کے پڑھتے تھے۔ اس لئے جو کچھ پڑھتے تھے اکثر بھول جاتے تھے۔ اپنے افسانہ ”آخری جینے“ میں لکھتے ہیں۔

”میرا حافظہ بہت قوی نہیں۔ تاریخ دنیا کی ساری اہم تاریخی فراموش ہو گئیں وہ ساری تاریخی جو باتوں کو جاگ کر طبیعت پر جبر ڈال کر یاد کی تھیں۔“

اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انھیں ہندوؤں سے چڑھتی تھی۔ وہ ریاضی میں کمزور واقع ہوئے تھے۔ دوسرے سکولوں میں جو تاریخ پڑھائی جاتی ہے اس میں سنوٹ کے سوا اور کچھ ہوتا ہی نہیں یا پھر بادشاہوں۔ شہروں اور لڑائیوں کے نام گنوائے جاتے ہیں اور ان سے جو واقعات وابستہ کئے جاتے ہیں انھیں اس قدر توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے کہ ان میں کوئی ربط اور سلسلہ نہیں ہوتا کیونکہ اس طبقہ واری سماج میں تاریخ کو چند خود مبرا فرادیا بادشاہوں کا کھیل دکھانا مقصود ہوتا ہے۔ اس تاریخ کے متعلق پریم چند نے آگے چل کر اپنا نظریہ چند الفاظ میں بڑی وضاحت سے بیان کر دیا ہے میرے بہترین افسانے کے دیباچہ میں لکھا ہے۔

”کہانی میں نام اور سنہ کے سوا باقی سب کچھ سچ ہے اور تاریخ میں نام اور سن کے سوا کچھ بھی حقیقت نہیں۔“ اسی مضمون میں وہ لکھتے ہیں ”ہماری روح کو عروجی قوت کہاں سے ملتی ہے؟ قوت تو مسلسل جدوجہد میں مصروف ہے ہمارا دل۔۔۔ رکاوٹوں کو پھاند کر اپنے فطری مقام پر پہنچنے کی خواہش کرتا رہتا ہے۔ اسی جدوجہد سے تو ادب کی تخلیق ہوتی ہے۔۔۔“

در اصل تاریخ بھی ادب ہے کیونکہ آدمی نے اپنی بے سروسامانی کی حالت سے اس دور تک پہنچنے کے لئے جو جدوجہد کی ہے اور دنیا کو اس دور سے بھی بہتر اور حسین بنانے کے لئے اب بھی اس کی جدوجہد جاری ہے اور جاری رہے گی۔ تاریخ اس مسلسل جدوجہد کی کہانی ہے۔ اقتدار پسند طبقہ نے اپنے مفاد کے پیش نظر اس میں بیجا تصرف کیا ہے جس سے یہ کہانی مسخ ہو گئی ہے۔ اسے حقیقی اور بچسپ بنانے کے لئے از سر نو لکھنے کی ضرورت ہے پھر اسے لڑکے بھی شوق سے پڑھیں گے۔ اور عجب ممالک میں طبقہ واری

سلاج ختم ہو گیا ہے وہاں تاریخ کو اس ڈھنگ سے لکھا بھی گیا ہے کیونکہ انھیں انسانی جدوجہد کو اپنے فطری مقام کی طرف آگے بڑھانا مقصود ہے۔ روس اس سلسلہ میں دوسرے ممالک کی رہنمائی کر رہا ہے کیونکہ سب سے پہلے طبقہ داری سماج وہاں ختم ہوا، چونکہ تاریخ کی سکولی کتاب میں روح کو گرمانے والی جدوجہد کا فقدان تھا۔

اور بے چارے دھنپت رائے روح کو گرمادینے والی محبت سے بھی محروم تھے۔ طلسم ہو شرابا کی کہانیاں پڑھنے کی طرف زیادہ مائل تھے۔ گو وہ طلسمی اور تخیلی نہیں لیکن ان میں روح کو گرمادینے والی حرارت موجود تھی کیونکہ بقول برم چند ”آج سے دو ہزار برس قبل یونان کے نامور فلاسفر افلاطون نے لکھا تھا کہ ہر تخیلی تخلیق میں بھی صداقت موجود“ کہانیوں کے علاوہ روح کو گرمانے والے دوسرے مشغفے بھی تھے۔ دیہات کے گلی ڈنڈی کی جگہ شہر میں گیند نے لی تھی۔ ”توبہ“ کہانی میں لکھتے ہیں:-

”جب میں اسکول میں پڑھتا تھا تو گیند کھیلتا تھا۔ اور ماسٹروں کی دھکیاں سہتا تھا۔ یعنی میرے بچپن کا زمانہ تھا۔ نہ عقل کا ظہور ہوا تھا نہ دانائی کی نشوونما۔“

سہم ظریفی دیکھتے کہ اس عمر میں روایت پرست باپ نے بیٹے کی شادی کر دی۔ وہ متعلقہ حکام سے کہہ سن کر پھر اپنے کاؤں کے ڈاک خانہ میں تبدیل ہو گئے تھے اور دھنپت رائے پیدل چل کر بنارس پڑھنے جاتے تھے۔ وہ ابھی میٹرک پاس بھی نہیں کرتے پائے کہ باپ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد پریم چند پر جو گزری اس کا ذکر انھوں نے بہت دلد و زپیرایہ میں بیان کیا ہے۔ خود نوشتہ سوانح حیات میں لکھتے ہیں:-

”میراجم سن ۱۹۳۳ء میں ہوا۔ والد ڈاک خانہ میں کلرک تھے۔ والدہ مرہٹھ تھیں ایک بڑی بہن تھیں۔ اس وقت والد شائد بیس روپے پاتے تھے۔ چالیس روپیہ تک

پہنچتے پہنچتے ان کا انتقال ہو گیا۔ یوں تو وہ بڑے دورانِ دلش محسوس اور دنیا میں آنکھیں کھول کر چلنے والے آدمی تھے۔ لیکن آخری عمر میں ٹھوکر کھا گئے۔ خود تو گرے ہی تھے اس دھکا میں مجھے بھی گرا دیا۔ پندرہ برس کی عمر میں انھوں نے میری شادی کر دی جس کے چند سال بعد ہی انھیں سفرِ آخرت دپیش ہو گیا اس وقت میں نویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ گھر میں میری بیوی، سوتیلی ماں اور ان کے دو لڑکے تھے۔ مگر آمدنی ایک پیسہ کی نہ تھی۔ گھر میں جو کچھ تھلا چھ ماہ تک والد کی علالت اور اس کے بعد تجویز و تکفین میں خرچ ہو گیا۔ مجھے ایم۔ اے پاس کرنے کا ارمان تھا۔ سرکاری ملازمت اس زمانہ میں بھی اتنی ہی مشکل سے ملتی تھی جتنی کہ اب۔ دوڑ دھوپ کر کے دس بارہ روپے کی جگہ پا جاتا، مگر یہاں تو آگے پڑھنے کی دھن تھی۔ مگر پاؤں میں لوہے کی نہیں اشٹ دھات کی بیڑیاں بیڑی ہوتی تھیں۔ اور میں پہاڑ پر چڑھنا چاہتا تھا۔

آگے پڑھنے کی دھن میں تعلیم جاری رکھی اور اسکول جانے کا نقشہ اس مضمون میں یوں پیش کیا ہے :-

”پاؤں میں جو تے نہ تھے، بدن پر نابت پڑے نہ تھے۔ گرانی الگ، دس سیر کے جو تھے۔ اسکول سے ساڑھے تین بجے چھٹی ملتی تھی۔ کونینس کالج بنارس میں پڑھتا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے فیس معاف کر دی تھی۔ امتحان سر پر تھا۔ اور میں بالنس کے چٹانک پر ایک لڑکے کو پڑھانے جایا کرتا تھا۔ جاڑے کا موسم تھا۔ چار بجے شام کو پہنچ جاتا اور چھ بجے چھٹی پاتا تھا۔ وہاں سے میرا گھر پانچ میل پر تھا۔

تیز چلنے پر بھی آٹھ بجے رات سے پہلے نہ پہنچ سکتا۔ سو بے چہرے آٹھ بجے گھر سے چل دیتا۔ ورنہ وقت پر اسکول نہ پہنچتا۔ رات کو کھانا کھا کر کپڑے کے سامنے پڑھنے بیٹھتا اور نہ معلوم کب سو جاتا۔

درسِ گاہ

دل پر جتنا گہرا صدمہ ہوتا ہے اپنے زبردِ عمل
کی صورت میں اتنا ہی مؤثر ہوتا ہے ۔۔

(پریم چند)

جو کی روٹیاں کھا کر اور بچے حالوں رہ کر دھنپت راتے لے میٹرک تو پاس کر لیا
لیکن ان کی منزل تھی ایم۔ اے پاس کرنا اور وکیل بننا۔ بے سروسامانی کی حالت میں
بھی انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ اپنی اس منزل کو حاصل کرنے کے لئے بہت کوشش
کی بہت پاڑ پیلے۔ لیکن پھر بھی ناکام رہنا پڑا۔ اپنی اس ناکامی کا ذکر پریم چند نے خود
کیا ہے اور بڑے دردناک پیرایہ میں کیا ہے۔

”میٹرکولیشن تو کسی طرح پاس ہو گیا۔ لیکن سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہوا،
اور کونٹنس کالج میں داخلہ کی کوئی امید نہ رہی۔ فیس صرف اول درجہ میں پاس ہونے

والوں کی معاف ہو سکتی تھی۔ خوش قسمتی سے اس سال ہندو کالج کھل گیا تھا۔ میں نے اس نئے کالج میں پڑھنے کا ارادہ کیا۔ مسٹر چرڈسن پرنسپل تھے۔ ان کے مکان پر گیا وہ سر سے پاؤں تک ہندوستانی لباس میں ملبوس تھے۔ اور دھوتی پہنے فرش پر بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے لیکن مزاج تبدیل کرنا اتنا آسان نہ تھا۔ میری گزارش سن کر درابھی میں آدھی ہی بات کہہ پایا تھا، بولے کہ گھر پر میں کالج کی بات نہیں سنتا۔ ناچار کالج گیا۔ ملاقات تو ہوئی۔ مگر ناامیدی کے سوا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اب کیا کروں۔ اگر کسی کی سفارش لے آتا تو شاید میری درخواست پر غور ہوتا لیکن ایک دیہاتی لڑکے کو شہر میں جانتا ہی کون تھا۔

روز گھر سے اس ارادہ سے نکلتا کہ کہیں سے سفارش لکھا لاؤں۔ لیکن بارہ میل کی منزل مار کر شام کو یوں ہی گھر واپس آ جاتا۔ شہر میں کوئی بات پوچھنے والا بھی نہ تھا۔

کئی دنوں کے بعد ایک سفارش ملی۔ ایک صاحب ٹھاکر اندرنارائن سنگھ ہندو کالج کی مجلس انتظامیہ کے رکن تھے۔ ان سے جا کر رویا انھیں مجھ پر رحم آیا۔ اور انھوں نے سفارشی چٹھی لکھ دی۔ اس وقت میری خوشی کی انتہا نہ تھی۔ بہر حال۔ خوش خوش گھر آیا۔ دوسرے دن پرنسپل صاحب سے ملنے کا ارادہ تھا۔ لیکن گھر پہنچتے ہی مجھے بخار آ گیا۔ اور دو ہفتے سے پہلے نہ ٹلا۔ نیم کا کاٹھا پیتے پیتے ناک میں دم آ گیا۔ ایک دن دروازہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ کہ میرے پر و ہت جی آ گئے۔ میری حالت دیکھ کر مزاج پُرسی کی اور فوراً کسی کھیت سے ایک جڑ بھو دلائے اور اسے دھو کر سٹا دانے کالی مرچ کے ساتھ پسوا کر مجھے پلا دیا۔ اس نے جادو کا اثر کیا۔ بخار چڑھنے میں گھٹتے

بھری دیر تھی۔ گرد و آلے گویا گھنٹے بھر کے اندر ہی اس کا گلا گھونٹ دیا۔ میں نے پنڈت جی سے بار بار اس جڑی کا نام پوچھا مگر انھوں نے نہ بتایا۔ کہا نام بتانے سے اس کا اثر جانا رہے گا۔

غرض ایک ہمدینہ کے بعد دوبارہ سٹر پر چڑھن سے ملا۔ اور انھیں ٹھاکر صاحب کا سفارشی خط دکھلایا۔ انھوں نے میری طرف گھور کر دیکھے ہوئے پوچھا:۔
 ”اتنے دنوں تک کہاں تھے؟“
 ”بیمار ہو گیا تھا۔“
 ”کیا بیماری تھی؟“

میں اس سوال کے لئے تیار نہ تھا۔ اگر بخار بتاتا تو شاید صاحب مجھے جھوٹا سمجھیں۔ بخار میری سمجھ میں معمولی بات تھی۔ جس کے لئے اتنی لمبی غیر حاضری کی ضرورت نہ تھی۔ کوئی ایسی بیماری بتانے کی فکر نہ تھی۔ جو محبوبوری اور تکلیف کے علاوہ رحم کے جذبات کو بھی ابھار سکے۔ اس وقت مجھے اور کسی بیماری کا نام یاد نہ آیا۔ ٹھاکر اندر نارائن سنگھ سے جب میں سفارش کے لئے ملا تھا تو انھوں نے اپنے احتلاج قلب کے مرض کا ذکر کیا تھا۔ ان کے الفاظ مجھے یاد آ گئے۔ میں نے کہا۔ پلٹیشن آف ہارٹ سر۔

PULPATION OF HEART SIR

صاحب نے متعجب ہو کر میری طرف دیکھا اور کہا اب تم بالکل اچھے ہوؤ؟
 ”جی ہاں۔“

”اچھا فارم داخلہ بھر کر لاؤ۔“

میں نے سمجھا چلو بیڑا پار ہوا، فارم لیا، خانہ پرسی کی اور پیش کر دیا۔ صاحب

اس وقت کسی کلاس میں پڑھا رہے تھے۔ تین بجے مجھے فارم واپس ملا۔ اس پر لکھا تھا۔
 ”اس کی لیاقت کی جانچ کی جائے“

یہ پیام حلقہ پیش آیا تو میرا دل بیٹھ گیا۔ انگریزی کے سوا اور کسی مضمون میں پاس ہونے کی امید نہ تھی۔ اور حساب و ریاضی سے تو میری روح کانپتی تھی۔ جو کچھ یاد تھا وہ بھی بھول گیا تھا۔ اب کوئی دوسری صورت کیا ہو سکتی تھی۔ تقدیر پر بھروسہ کر کے کلاس میں گیا اور اپنا فارم دکھایا۔ پروفیسر صاحب بنگالی تھے انگریزی پڑھا رہے تھے۔ واشنگٹن ارونگ کارپوریشن رچرل RICHVAN WRINKLE کا سبق تھا۔ مین پیچھے کی قطار میں جا کر بیٹھ گیا۔ اور دہری چارمنٹ میں مجھے معلوم ہوا کہ پروفیسر صاحب اپنے مضمون پر پوری طرح حاوی ہیں۔ گھنٹہ ختم ہوتے ہی انہوں نے آج کے سبق پر مجھ سے مختلف سوالات کئے۔ اور میرے جوابات سن کر میری غیضی پر اطمینان بخش ”کا لفظ لکھ دیا۔

دوسرا گھنٹہ حساب کا تھا اس کے پروفیسر بھی بنگالی تھے میں نے اپنا فارم دکھایا نئی درسگاہوں میں عموماً وہی طلباء آتے ہیں جنہیں کہیں جگہ نہیں ملتی۔ یہاں بھی یہی حال تھا۔ کلاسوں میں کم استعداد اور ناقابل طلباء بھرے پڑے تھے۔ پہلے ریٹے میں جو آیا وہ بھرتی ہو گیا۔ بھوک میں ساگ پات بھی لذیذ معلوم ہوتا ہے۔ مگر اب پیٹ بھر گیا تھا۔ طلباء چُن چُن کر لئے جاتے تھے۔ پروفیسر صاحب نے حساب میں میرا امتحان لیا۔ اور میں فیل ہو گیا، فارم پر حساب کے خانہ میں ”نا قابل اطمینان“ لکھ دیا۔

میں اتنا ناامید ہوا کہ فارم لے کر دوبارہ پرنسپل کے پاس نہ گیا۔ سیدھا گھر چلا آیا۔ حساب میرے لئے ہمیشہ پہاڑ کی چوٹی تھی۔ انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں حساب

دومرتبہ فیل ہوا۔ اور نا امید ہو کر امتحان دینا چھوڑ دیا۔ دس بارہ سال کے بعد جب ریاضی کا مضمون اختیاری ہو گیا۔ میں نے دوسرے سبکٹے کر آسانی سے انٹرمیڈیٹ پاس کر لیا۔ اس وقت تک ریاضی کی بدولت صد ہا طلباء کی آرزووں کا خون ہوا۔ خیر میں نا امید ہو کر گھر لوٹ آیا۔ لیکن پڑھنے کی تنہا باقی ہی رہی۔ گھر بیٹھ کر کیا کرتا۔ کسی طرح حساب پختہ کر کے پھر کالج میں داخل ہو جاؤں گا۔ یہی دھن تھی مگر اس کے لئے شہر میں رہنا ضروری تھا۔ اتفاق سے ایک وکیل صاحب کے رٹکوں کو پڑھانے کا کام مل گیا۔ پانچ روپیہ تنخواہ ٹھہری۔ میں نے دو روپیہ میں گزارہ کر کے تین روپیہ گھر دینے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ وکیل صاحب کے اسٹبل کے اوپر ایک چھوٹی سی کچی کوٹھڑی تھی۔ اس میں رہنے کی اجازت مل گئی۔ ایک ٹاٹ کا ٹکڑا بچھا لیا۔ بازار سے ایک چھوٹا سا میپ لے آیا۔ اور شہر میں رہنے لگا۔ گھر سے کچھ برتن بھی لایا۔ ایک وقت کھجڑی پکا لیتا اور دھومناج کر گھر چلا جاتا۔ حساب تو بہانہ تھا۔ ناول وغیرہ پڑھا کرتا۔ پنڈت رتن ناتھ درکاٹاؒ افسانہ آزادؒ انھیں دنوں پڑھا۔ ”چندر کانتا سنتی“ بھی پڑھا۔ بنکم بابو کے اردو ترجمے بھی جتنے لائبریری میں تھے سب پڑھ ڈالے۔ جن وکیل صاحب کے رٹکوں کو پڑھاتا تھا ان کے سارے میٹریکولیشن میں میرے ساتھ پڑھتے تھے انھیں کی سفارش سے مجھے یہ ٹیوشن ملا تھا۔ اس دوستی کی وجہ سے جب ضرورت ہوتی ان سے پیسہ ادھار لے لیا کرتا اور تنخواہ ملنے پر حساب بیدیا کر دیتا۔ کبھی دو روپے ہاتھ آتے کبھی تین۔ جس دن تنخواہ کے دو تین روپے ملتے میری قوت ارادی کی باگ ڈھیلی۔ ہو جاتی۔ لپجائی ہوئی آنکھیں حلوائی کی دوکان کی طرف کھینچ لے جاتیں اور دو تین آنے کے پیسے ختم کئے بغیر واپس نہ آتا۔ پھر اسی دن گھر جاتا اور دو ڈھائی روپے دے آتا

دوسرے دن سے پھر ادھار لینا شروع کر دیتا۔ لیکن کبھی کبھی ادھار لینے میں پس و پیش بھی ہوتا۔ جس کی وجہ سے سارا دن روزہ رکھنا پڑتا۔

اس طرح چار باپخ مہینے گزر گئے۔ اس درمیان ایک ہزار سے دو ڈھائی روپے کے کپڑے ادھار لئے تھے روز ادھر سے نکلتا ہوتا تھا۔ اس کا مجھ پر پورا بھروسہ تھا۔ جب مہینے دو مہینے ہو گئے اور میں پیسے نہ چکا سکا۔ تو پھر میں نے ادھر سے نکلتا ہی چھوڑ دیا۔ چکر دے کر نکل جاتا۔ تین سال میں اس کے روپے ادا کر سکا۔ اسی زمانہ میں شہر کا ایک بیلدار مجھ سے کچھ ہندی پڑھنے آیا کرتا تھا۔ اس کا گھر وکیل صاحب کے مکان کی پشت پر تھا۔ ”جان لو۔ بھیا“ اس کا سخن تکیہ تھا۔ چنانچہ سب لوگ اسے ”جان لو بھیا“ ہی کہتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے اس سے آٹھ آنے کے پیسے ادھار لئے تھے یہ پیسے اس نے مجھ سے میرے گاؤں میں جا کر باپخ برس کے بعد وصول کئے۔ اب بھی میری پڑھنے کی خواہش تھی۔ لیکن روز بروز ناامید ہوتا جاتا تھا۔ جی چاہتا تھا کہیں نوکری مل جائے تو کروں۔ لیکن نوکری کسی طرح اور کہاں ملتی ہے، یہ مجھے معلوم نہ تھا۔

جاڑے کا موسم تھا مگر کوڑی پاس نہ تھی۔ دو دن تک تو ایک ایک پیسے کے بھنے ہوئے چنے کھا کر کاٹے۔ میرے ہا جن نے ادھار دینے سے انکار کر دیا۔ اور میں محاذ کے مارے کسی سے مانگ نہ سکتا تھا۔ چراغ جل چکے تھے۔ اس وقت میں ایک بک سیلر کی دوکان پر ایک کتاب بیچنے گیا۔ پروفیسر حکرورتی کی بنائی ہوئی ارتھ میٹک کی شرح تھی۔ جو میں نے دو سال ہوئے خریدی تھی۔ اب تک اسے بڑی احتیاط سے رکھا تھا۔ لیکن آج جب چاروں طرف سے مایوس ہو گیا تو اسے فروخت کرنے کا ارادہ تھا۔ کتاب کی قیمت دو روپے تھی۔ لیکن ایک روپیہ میں سودا ہوا۔ میں روپیہ لے کر دوکان

سے اترا ہی تھا کہ لمبی مونچھوں والے ایک متین شخص نے مجھ سے پوچھا۔

”تم یہاں کہاں پڑھتے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”پڑھتا تو کہیں نہیں۔۔۔ پر کہیں نام لکھانے کی فکر میں ہوں۔“

”میٹرکولیشن پاس ہو؟“

”جی ہاں۔“

”لو کری تو نہیں چاہتے؟“

”لو کری کہیں ملتی نہیں۔“

یہ بھلے مانس کسی چھوٹے سے سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ اور انھیں ایک سسٹنٹ ماسٹر کی ضرورت تھی۔ اٹھارہ روپے تنخواہ پر مجھے ملازم رکھ لیا۔ اس وقت اٹھارہ روپے میری مایوس تنہا کی معراج تھے۔ میں دوسرے دن ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس حاضر ہونے کا وعدہ کر کے چلا تو باؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔ یہ ۱۸۹۹ء کی بات ہے۔ میں گرد و پیش کے حالات کا مقابلہ کرنے کو تیار تھا۔ اور اگر ریاضی کی وجہ سے اٹک نہ جاتا تو ضرور آگے تک جاتا۔ مگر ریاضی نے سارے ارمان خاک میں ملا دیئے۔ دھنپت رائے نے بیشک یہی سمجھا ہو گا کہ ارمان ریاضی نے خاک میں ملا دیئے اور یکایک نوکری مل جانے سے وہ قسمت کے قائل بھی ہو گئے تھے۔ ہو جانا ضروری تھا۔ کیونکہ اندھے افلاس کا قسمت ہی ایک سہارا ہے۔

لیکن بعد ازاں جب ساری زندگی ہی ارمان خاک میں ملتے رہے اور پریم چند بن کر بھی ناموافق حالات میں مرضی کے خلاف کام کرنا پڑا تو معلوم ہوا کہ ارمان خاک میں ملانے والی قوتیں بہت زبردست ہیں جو ریاضی کے پیچھے چھپی ہوئی ہیں

اور ان سے لڑنا ضروری ہے۔ پانچ سو صفحے کا ناول ”کنو دانا“ انہی ارمالوں کے خاک میں ملنے کی کہانی ہے۔ بھوری کی ناکامیاں پریم چند کی اپنی ناکامیاں ہیں۔ اس ناول میں انہوں نے ایک فقرہ لکھا ہے جو سارے ناول کا پنچوڑ ہے اور دھنیت رائے کی اس کیفیت کی بہترین ترجمانی کرتا ہے۔ لکھا ہے:۔

”زندگی کی ٹریجڈی اس کے سوا اور کیا ہے کہ آپ کا دل جو کام نہیں کرنا چاہتا وہ آپ کو کرنا پڑے۔“

اس ٹریجڈی کو محسوس کرتے ہوئے انہوں نے اس زمانہ کے حالات مختصر سے مضمون میں کافی تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ مگر ان کی زندگی کی یہ تصویر ابھی ادھوری ہے۔ گھر پر سوتیلی ماں تھی۔ اسے وہ چاچی کہتے تھے۔ خاوند کی موت سے ان کے ارمان بھی خاک میں مل گئے تھے۔ دھنیت رائے کی اپنی بیوی تھی جب شوہر یوں کس پیرسی کی حالت میں زندگی بسر کر رہا تھا تو اس نوجوان عورت کے ارمان بھی خاک میں مل رہے تھے۔ اس کی بابت پریم چند نے براہ راست کچھ نہیں لکھا۔ لیکن وہ اس کی زندگی کا حصہ تھے۔ وہ اس کے ارمالوں کا خون ہوتے دیکھیں اور محسوس نہ کریں ممکن نہیں تھا۔ باپ کی موت کے بعد سوتیلی ماں کے جذبات غلیظ کی کہانی میں بخوبی بیان کئے ہیں۔ لیکن کہانی سوانح حیات نہیں۔ اپنی زندگی کی تصویر کرتے ہوئے بھی کہانی کے تقاضہ کے مطابق اس میں کچھ رد و بدل کرنا پڑتا ہے۔

نام ہی مختلف نہیں ہوتے زیب داستان کے لئے ماحول بھی ذرا بدل دیا جاتا ہے۔ واقعات اور افراد رائے گئے وہی نہیں ہوتے۔ لیکن ان کی تہ میں کارفرما حقیقت ایک ہی ہوتی ہے۔ اس لئے جزئیات کی بجائے حقیقت پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

کہتے ہیں۔ ”پتا کے چار بچے تھے۔ تین لڑکے اور ایک لڑکی۔ اتنا بڑا خرچ اور کمانے والا کوئی نہیں۔ رگھو اب کیوں بات پوچھنے لگا۔۔۔ اپنی بیوی لائے گا اور الگ رہے گا۔ پتا کو چاروں طرف اندھیرا نظر آتا تھا۔ مگر کچھ بھی ہو وہ رگھو کی دست نگر بن کر گھر میں نہ رہے گی۔ جس گھر میں اس نے راج کیا اس میں اب لونڈی نہ بنے گی جس لونڈے کو اپنا غلام سمجھا اس کا منہ نہ تنکے کی وہ حسین تھی۔ ابھی اس کی عمر بھی کچھ زیادہ نہ تھی۔ اس کا حسن ابھی پوری بہار پر تھا۔ وہ کوئی دوسرا گھر کرے گی۔ یہی ہو گا نہ لوگ نہیں گئے۔ ہنسنے دو۔۔۔۔۔ رگھو کی ذہیل بن کر کیوں رہوں۔

بھولا کو مر۔ ایک مہینہ گزر گیا تھا شام ہو گئی۔ پتا اسی تشویش میں پڑی ہوئی تھی کہ یکایک اسے خیال آیا لڑکے گھر میں نہیں ہیں۔ بیلوں کے آنے کا وقت ہے کہیں راستے میں نہ پڑ جائیں۔ اب دروازہ پر کون ہے جو ان کی نگرانی کرے گا۔ رگھو تو یہی چاہے گا کہ نہ کچلتے ہوں تو کھل جائیں۔ میرے لڑکے تو اسے پھوٹی آنکھوں میں بھلتے۔ کبھی ہنس کر نہیں بولتا۔ گھر سے باہر نکلی تو دیکھا۔ رگھو سامنے جھونپڑے میں بیٹھا اوکھ کی گنڈیریاں بنا رہا ہے۔ تینوں لڑکے اس کے سامنے کھڑے ہیں۔ اور چھوٹی لڑکی اس کی گردن میں ہاتھ ڈالے۔ اس کی پیٹھ پر سوار ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔ ماں کو آنکھوں پر اعتبار نہ آیا۔ آج تو یہ نئی بات ہے۔ شاید دنیا کو دکھاتا ہے کہ میں اپنے بھائیوں کو کتنا چاہتا ہوں۔ اور من میں چھری رکھی ہوئی ہے۔ گھات ملے تو جان ہی لے لے۔ کالا سانپ ہے۔ کالا سانپ۔ تند لہجہ میں بولی۔ تم سب کے سب وہاں کیا کرتے ہو۔ گھر میں آؤ۔ سانچھ کی پیرا ہے گورے آتے ہوں گے۔

رگھو نے التجا کی آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ میں تو ہوں کاکی ڈر کس بات کا۔
 بڑا رکیدار بولا۔ کاکی۔ رگھو دادا نے آج ہمارے لئے دو گاڑیاں بنا دی ہیں
 یہ دیکھو ایک پریم اور گھنٹہ بیٹھیں گے۔ دوسری پر کھمن اور جھینا دادا دونوں گاڑیاں
 کھینچیں گے۔

یہ کہہ کر وہ ایک کونے سے دو چھوٹی چھوٹی گاڑیاں نکال لیا۔ چار چار پہتے
 لگے مہوتے تھے۔ بیٹھنے کے لئے تختے تھے۔ اور روک کے لئے دونوں طرف بازو لئے ہوئے
 پٹانے تعجب سے پوچھا۔ گاڑیاں کس نے بنائیں؟
 کیدار نے کچھ چڑھ کر کہا۔ رگھو دادا نے بنائیں اور کس نے۔ بھگت کے گھرت
 بسولا اور کھانی مانگ لائے۔ اور جھٹ پٹ بنا دیں۔ کھوب دوڑتی ہے کاکی۔
 بیٹھو کھڑکیں کھینچیں۔

گھنٹہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ کیدار کھینچنے لگا۔ چپ چپ کا شور ہوا۔ گویا گاڑی
 بھی اس کھیل میں رٹکوں کے ساتھ شریک ہے کھمن نے دوسری گاڑی میں بیٹھ کر
 کہا دادا کھینچو۔

رگھو نے جھینا کو بھی گاڑی میں بٹھا دیا۔ اور گاڑی کھینچتا ہوا دوڑا۔ تینوں
 رٹکے تالیاں بجانے لگے۔ پتا تعجب انگیز نظروں سے یہ نشاۃ دیکھ رہی تھی اور سوج
 رہی تھی یہ وہی رگھو پٹ یا کوئی اور؟

دراصل یہ پریم چند کا اپنا کردار ہے۔ یہ بے لوث شرافت۔ ان پر ہر دینا تو
 کے رگ رگ میں بسی رہتی ہے جس کا ثبوت صرف رگھو نے ہی نہیں "منتر" کہانی کا بلکہ
 بھگت بھی دیتا ہے۔ اور "ج اکبر" اندہ ہا ترقد کی غریب دایہ دیتی ہے۔

دھنپت رائے نے بھی انہی دیہاتیوں کے درمیان رہ کر پرورش پائی تھی چنانچہ یہ شرافت اس کی زندگی کا جزو بن گئی تھی۔ اور اس کی بدولت پریم چند اس نتیجہ پر پہنچے تھے۔

”کسان پورا سوار تھی ہوتا ہے اس میں شبہ نہیں۔۔۔۔۔ لیکن اس کی ساری زندگی قدرت کا پورا ساتھ دیتے ہوئے گذرتی ہے۔ پٹروں میں پھل لگتے ہیں۔ جنھیں سب کھاتے ہیں۔ بادل سے پانی برستا ہے جس سے زمین آسودہ ہوتی ہے۔۔۔۔۔ ایسے حالات میں مذموم خود غرضی کی گنجائش کہاں؟ ہو رہی کسان تھا اور کسی کے جلتے ہوئے گھر میں ہاتھ سینکنا اس نے سیکھا ہی نہ تھا۔“

(گنودان)

اسی ناول میں دوسری جگہ تحریر کیا ہے؟۔۔۔ سبھی حقیقی انسانوں میں ترک و ایثار کا جذبہ چھپا رہتا ہے اور روشنی پا کر چمک اٹھتا ہے۔“

دھنپت رائے نے بھی فطرت کے مناسط سے اپنی روح کو آسودہ کیا تھا۔ اور روشنی میں رہ کر زندگی بسر کی تھی۔ اس لئے اس میں یہ جذبہ خود بخود پرورش پاتا رہا۔ چمکتا ہی رہا۔ کبھی مدھم نہیں ہوا۔ وہ سوتیلی ماں اور اس کے بیٹوں کی امداد ہمیشہ کرتے رہے۔ سوتیلی ماں اپنے چھوٹے بھائی کو بھی ساتھ لائی تھی۔ جو وہیں رہتا اور پلتا تھا۔ جب یوشن میں صرف پانچ روپے پاتے تھے تو ڈھائی روپے گھر دے آتے تھے اور جب اٹھارہ روپے کی ملازمت ملی تو بھی نصف یا اس سے بھی زیادہ گھر بھیجتے تھے یہ بچت کرتے وقت انھیں کتنی دقت ہوتی تھی۔ اس کا اندازہ ”مستعار گھڑی“ کہانی کے ہیرو کی مشکلات سے لگایا جاسکتا ہے۔ جو اپنے دوست کی کھوئی ہوئی گھڑی

کی قیمت چکا دینے کے لئے اپنا جگر کاٹ کر قلیل تنخواہ میں سے ہر مہینے نصف روپے بچاتا ہے۔

دھنپت رائے مونچھوں والے متین اور شریف آدمی کے طفیل سے ماسٹر ہو گئے۔ اب وہاں کیسے رہتے تھے ہیں اس کا نقشہ ”مستعار گھڑی“ میں یوں کھینچا ہے۔

”دوسرے دن ایک بہت سستے ہوٹل میں اُٹھ گیا۔ ہوٹل تو نام تھا۔ تھا وہ ایک چڑیا خانہ۔ بارہ روپے میں انتظام ہو گیا۔ اکلانے کے اور دو مکان کے۔ ناشتہ کے لئے دو دھار چائے کی جگہ ایک آنے کے چنے لاکر رکھ دیئے۔ اوپر کے مصارف کے لئے تین روپے رکھ دیئے۔ صاف ۵ پنچ گئے۔ سخت نفیس کٹی تھی۔ تپسیا سمجھ لو۔ نہ پان، نہ سگریٹ، نہ چاٹ، نہ مٹھائی، نہ لیمونیڈ، نہ برف نہ کسی کے ہاں آنا جانا۔ پورا سنیاس تھا۔ خواہشیں بار بار اٹھتی تھیں۔ لیکن حباب کی مانند اپنی بے بضاعتی کے احساس سے بیٹھ جاتی تھیں۔ جب میں نے۔ مہینہ کے آخر میں ۱۵ روپے لے کر دانو کو دیئے تو ایسا معلوم ہوا کہ میرا سر کچھ اونچا ہو گیا ہے۔ میں کتنی انگل لمبا ہو گیا ہوں۔ ایسی پر غرور مسرت اپنی زندگی میں مجھے کبھی نہ نصیب ہوئی تھی۔

یہ کتنی انگل لمبا ہو جانے والا شخص دھنپت رائے ہے۔ جس نے ۱۵ انہیں تو کم از کم نو دس روپے منی آرڈر سے یا کسی دوسرے طریقہ سے گھر بھیجے ہیں۔ گھڑی کھوجانے کا تو محض بہانہ ہے۔ جو آدمی دکھاوے کے لئے گھڑی کھودے اور اسے مجبوراً اس کی قیمت ادا کر نی پڑے وہ ایسی پر غرور مسرت محسوس نہیں کر سکتا۔ یہ

تو ہریم چند کا اپنا ایثار ہے۔ اور روپے بھیج دینے کے بعد کی کیفیات کا جائزہ اس طرح لیا ہے :-

”یہاں سے لوٹا تو مجھے اپنے دل میں ایک نئی قوت ایک مردانہ حوصلہ کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ بے دلی جو دل پر مسلط رہتی تھی غائب ہو گئی۔“

”مزاج میں بھی نمایاں تبدیلی پیدا ہونے لگی۔ جن خواہشات کا روکنا میرے لئے امر محال تھا۔ ان کی طرف اب میرا خیال بھی نہ جاتا تھا۔ جس پان کی دوکان پر اپنا دل بے قرار ہو جاتا تھا۔ اس طرف سے اب میں یوں سر اٹھائے نکل جاتا تھا۔ گویا پان کھانا زانوں کا کام ہو۔ میرے لئے سخت معیوب۔ سگریٹ چلئے چاٹ کسی چیز کی طرف دل مائل نہ ہوتا تھا۔ صبح کو کھیگے ہوئے چنے۔ دونوں وقت روٹی اور دال۔ بس اس کے سوا میرے لئے دنیا کی سب چیزیں ممنوع تھیں۔ میں ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ بھی نہ سکتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مجھے اب زندگی سے خاص الفت ہو گئی تھی۔ افلاس موت کو دعوت کہاں سے دیتا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں زندگی میں کچھ کر سکتا ہوں۔“

”ٹاشری کہانی کے ان الفاظ سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں اور میرے پاس بھی روپے نہ تھے۔ میں اسکول میں ماسٹر تھا۔ بیس روپے ملے تھے۔ دس گھر بھیج دیتا تھا۔ دس میں لٹم لٹم اپنا گزارہ کرتا تھا۔ ایسی حالت میں پانچ روپے کا ٹکٹ خریدنا میرے لئے مشکل ہی نہیں محال تھا۔“

ادھر ہریم چند گھروالوں کے لئے ایثار کر کے لاثانی عظمت سے روشناس ہو رہے تھے۔ ادھر ان کی بیوی کا رویہ بالکل مختلف تھا۔ اس کے رویہ کی وضاحت کے لئے

ہم پھر علاحدگی“ کہانی کی طرف لوٹتے ہیں۔ پتا کے کہنے سننے سے رکھو نے باپ کی موت کے تھوڑے عرصہ بعد شادی کر لی تھی۔ اس کی بیوی ملیا کے متعلق لکھتے ہیں: ”ملیا میکے ہی سے شمشیر برہنہ آئی تھی۔ میرا شوہر چھاتی بھاڑ کر کام کرے اور ہٹارانی بنی بیٹھی رہیں۔ ان کے لڑکے رئیس زادے بنے کھویں۔ ملیا سے یہ برداشت نہ ہوگا۔ وہ کسی کی غلامی نہ کرے گی۔ اپنے لڑکے تو اپنے ہوتے نہیں۔ بھائی کس کے ہوتے ہیں۔ جب تک پر نہیں نکلتے ہیں۔ بھائی کو گھیرے ہوئے ہیں۔ یوں ہی ذرا سیانے ہوئے پر جھاڑ کر نکل جائیں گے۔ بات بھی نہ پوچھیں گے۔

ایک دن اس نے رکھو سے کہا۔ تم نے اس طرح گلا کھائی کرنی ہو تو کرو مجھ سے تو نہ ہوگی۔

رکھو: تو پھر کیا کروں۔ تو ہی بتا۔ لڑکے ابھی گھر کا کام کرنے کے لائق بھی تو نہیں ہیں۔

ملیا: لڑکے راوت کے ہیں۔ کچھ ہمارے تو نہیں ہیں۔ یہی پتا ہیں جو ہمیں دانہ دانہ کو ترسائی تھیں۔ سب سب چکی ہوں۔ میں لونڈی بن کر نہ رہوں گی۔ روپے پیسے کا مجھے کچھ حساب نہیں ملتا۔ نہ جانے تم کیا لاتے ہو۔ اور وہ کیا کرتی ہیں۔ ڈھائی سو کا گڑ بکا۔ روپے کہاں گئے مجھے دیکھنے کو بھی نہ ملے۔ تم سچھتے ہو روپے گھر ہی میں تو ہیں۔ مگر دیکھ لینا جو تھیں ایک پھوٹی کوڑی بھی ملے۔

رکھو: تو گھر کی مالکن بن جائے گی تو دنیا کیا کہے گی۔ یہ تو سوچ۔

ملیا: سونیا جو چاہتے تھے۔ گونڈھے ہاتھوں کی نہیں ہوں۔ دیکھ لینا۔ بھاڑ لیپ کر ہاتھ کالا ہی رہے گا۔ پھر تم اپنی ماں اور بیانی بہنوں کے لئے مرو۔ میں

کیوں مروں؟

لیکن پریم چند نے اپنا روتہ نہیں بدلا وہ خود تنگدست رہ کر... بھی
تاعمر سوتیلی ماں اور بھائیوں کی امداد کرتے رہے ۔

سکول ماسٹر

وہ مبارک اوقات جن سے زندگی کے نئے

دور کا آغاز ہوتا ہے ہمارے جذبات میں

خلوص اور اعتماد پیدا کر دیتے ہیں۔۔۔ (پریم چند)

اب پریم چند سکول ماسٹر تھے مگر وہ اس سے مطمئن نہیں تھے۔ کیونکہ انہوں نے ملازمت دل سے قبول نہیں کی تھی ناسازگار حالات نے زبردستی اس طرف دھکیل دیا۔ تعلیم ادھوری رہ جانے کی پھانس دل میں اٹکی ہوئی تھی۔ وہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے اس زندگی سے چھٹکارا چاہتے تھے۔ لیکن ہیڈ ماسٹر شریف تھا۔ اس نے سمجھا بوجھا انہیں اس کام پر لگا رکھا۔ پریم چند نے اپنی کہانی تہول کی چھٹی میں شروع کی کیفیت اس طرح بیان کی ہے۔

”ورنیکر فائنل پاس کرنے کے بعد مجھے ایک پرائمری مدرسہ میں جگہ مل گئی۔ جو

میرے گھر سے گیارہ میل پر تھا۔ ہمارے ہیڈ ماسٹر کو تعطیلوں میں بھی لڑکوں کو
پڑھانے کا ضبط تھا۔۔۔۔۔ اپریل میں سالانہ امتحان ہونے والا تھا۔ اس نے جنوری
ہی سے ہائے توجہ مچی ہوئی ہے۔ نائب مدرسوں پر اتنی عنایت تھی کہ رات کی کلاسوں
میں انھیں نہ طلب کیا جاتا تھا۔ مگر تعطیل بالکل نہ ملتی تھی۔ سو موٹی اماوس آئی اور
محل گئی۔ شور راتری آئی اور چلی گئی۔۔۔۔۔ اس نے مجھے کئی ہینوں سے گھر جانے کا
موقع نہ ملا تھا۔ مگر اب کے میں نے معصم ارادہ کر لیا تھا کہ ہولی پر ضرور گھر جاؤں گا۔
چاہے نوکری سے ہاتھ ہی کیوں نہ دھونا پڑیں۔ میں نے ایک ہفتہ پہلے ہی ہیڈ ماسٹر صاحب
کو اٹنی میٹم دیدیا کہ ۲۰ مارچ کو ہولی کی تعطیل شروع ہوگی اور بندہ ۱۹ کی شام کو
رخصت ہو جائیگا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھے سمجھایا کہ ابھی لڑکے ہوتے ہیں کیا معلوم
نوکری کتنی مشکلوں سے بھرتی ہے۔ اور کتنی مشکلوں سے چلتی ہے۔ نوکری پانا اتنا
مشکل نہیں جتنا کہ اس کا بھانا۔ اپریل میں امتحان ہونے والا ہے۔ تین چار دن مدر
بند رہا۔ تو بتاؤ کتنے لڑکے پاس ہوں گے۔ سال جبر کی ساری محنت پر پانی پھر جائے گا
کہ نہیں۔ میرا کہنا مانو۔ اس تعطیل میں نہ جاؤ۔ امتحان کے بعد جو تعطیل پڑے اس میں
چلے جانا۔ بیٹری کی چار دن کی تعطیل ہوگی۔ میں ایک دن کے لئے بھی نہ روکوں گا۔ میں
اپنے مورچے پر قائم رہا۔ فہمائش اور تحریف کسی اسلحہ کا مجھ پر اثر نہ ہوا۔ ۱۹ کو جو ہنی مدر
بند ہوا۔ میں نے ہیڈ ماسٹر صاحب کو سلام بھی نہ کیا۔ اور چپکے سے اپنی جلتے قیام پر
چلا آیا۔ انھیں سلام کرنے جانا تو وہ ایک نہ ایک کام نکال کر مجھے روک لیتے۔ رجسٹر
میں فیس کی میزان لگاتے جاؤ۔ اوسط حاضری نکالتے جاؤ۔ لڑکوں کی مشرقی کاپیاں
جمع کر کے ان پر اصلاح اور تاریخ سب مکمل کر دو۔ گویا یہ میرا آخری سفر ہے اور مجھے زندگی

کے سارے کام بھی ختم کر دینے چاہئیں۔“

اس اقتباس میں پریم چند نے مدرّس کے ایسے کام گنوائے ہیں جن سے انھیں کوئی کچھ ہی نہیں تھی۔ وہ اس سے اچھا اور بہتر کام کرنا چاہتے تھے۔ مشقی کاموں کی اصلاح کرنے کی بجائے ایم۔ اے۔ پاس کر کے وکیل بننا چاہتے تھے۔ اگر یہ نہیں ہو سکا تو وہ یہاں کیوں جھک مارتے رہیں۔ نوزی سے اکتا دینے والی دوسری بات تھی۔ قلیل تنخواہ جس کا انھیں بے حد رنج تھا۔ لکھتے ہیں :-

”بہت چند دھڑلے ایک اپر پرائمری مدرسہ میں مدرسہ تو کر لی تھی۔ مگر ہمیشہ پھٹتا کرتے تھے کہ ناحق اس جہال میں آ پھنسے۔ اگر کسی اور صیغہ میں ہوتے تو اب تک ہاتھ میں چار پیسے ہوتے۔ آرام سے زندگی بسر ہوتی۔ یہاں تہینہ بھر کے انتظار کے بعد کہیں پندرہ روپے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ وہ ادھر ادھر غائب۔ نہ کھانے کا شکم نہ پینے کا آرام۔“

کھانے پینے کا آرام نہ ہوتے ہوئے بھی ہم دیکھ چکے ہیں کہ انھیں سوتیلی ماں اور بھائیوں کی امداد کر کے یہ تسکین حاصل ہو گئی تھی کہ میں بھی دنیا میں کچھ کر سکتا ہوں دوسرے ہیڈ ماسٹر شریف اور روادار تھا۔ اس نے نوکری بجاتے رہے۔ مگر ایم اے پاس کرنے کا ارمان غلبش بن کر دل میں کھٹکتا رہا۔ اور انھوں نے ذہنی طور پر ماحول کے خلاف جدوجہد جاری رکھی۔ اپنی ایک کہانی ”لال فیتے“ میں لکھتے ہیں۔

”مگر مہری بلا اس کا شوق طلب اس کڑی اور سردی سے مستغنی تھا۔ اس غم قوی کے ساتھ جو اکثر نادار طلباء کا مایہ الامتیاز ہے۔ وہ کالج میں داخل ہو گیا۔ اگرچہ وہ ایک رتیس کے رٹکے پڑھا کر تعلیمی مصارف نکال لیا کرتا تھا۔ مگر وقتاً فوقتاً اس

یک مشت رقموں کی ضرورت ہوتی تھی۔

پریم چند آگے بڑھنے کی کیا کیا سبکیں سوچتے تھے اور انھیں کون کونسی مشکلات نظر آتی تھیں۔ یہ اقتباس ان کا ایک عکس ہے۔ اور ہری بلاس خود انھیں کا نمائندہ ہے جو خارجی حالات کے خلاف ان تھک جدوجہد جاری رکھتا ہے۔ وہ کسی صورت بھی شکست قبول کرنے کو تیار نہیں ہے۔ آخر اس کے عزم قوی کو کامرانی نصیب ہوتی ہے۔ یہی ہری بلاس ہیں پھر شکست کی فتح ”کہانی میں نظر آتا ہے۔ اس وقت وہ پڑھائی کے تمام مدارج طے کر چکا ہے۔ کالج میں پروفیسر ہے۔ اور خوشحال زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس کی بابت بھیاوتی کی زبان سے یہ الفاظ نکلتے ہیں:۔

”بابو جی نے محض اپنی محنت اور کوشش سے پرائیویٹ ٹیوشن کر کے یہ درجہ حاصل کیا ہے۔“

پریم چند کو خوشحال زندگی بسر کرنا ساری عمر نصیب نہیں ہوا۔ لیکن وہ اپنے لئے اور ہندوستانی عوام کے لئے ہمیشہ خوشحال زندگی کے خواب دیکھتے رہے۔ اور اپنے ان خوابوں کو حقیقت میں ڈھالنے کے لئے جدوجہد کرتے رہے۔ انھوں نے اس پرائمری سکول کی مدرسہ کرتے ہوئے دو مرتبہ انٹر میڈیٹ کا امتحان دیا۔ اور دونوں مرتبہ ریاضی کے باعث فیل ہو گئے۔

لیکن تعلیم جاری رکھنے کی جلد ہی ایک دوسری صورت پیدا ہو گئی۔ دو تین سال کی سروس کے بعد پرائمری سکول کے مدرسوں کو سرکاری طور پر ٹریننگ دی جاتی تھی۔ چنانچہ پریم چند بھی ۱۹۰۷ء میں ٹریننگ کالج الہ آباد میں داخل ہو گئے۔ پریم چند کے ایک ہم سبق بابو کرشن لال نے ”زمانہ“ کانپور پریم چند نمبر

میں اس دور کے متعلق ایک مضمون لکھا ہے۔

دہ پریپریٹری کلاس (PREPARATORY CLASS) میں داخل ہونے اٹرنس پاس امیدوار ایک سال اسی کلاس میں تعلیم پاتے تھے اور دوسرے سال جوئیر کلاس میں۔ اس وقت صوبہ ہذا میں ہی ایک ٹریننگ کالج تھا۔ جوئیر سینئر کے میوہل ٹیچرز ساتھ ساتھ تعلیم و تربیت حاصل کرتے تھے۔ اس کے پرنسپل ہر دل عزیز مسٹر کیمپلسٹر مرحوم اپنے شاگردوں کے سچے ہی خواہ تھے اور مددگار تھے۔ یہاں سے ۱۹۵۶ء میں مرحوم جوئیر کلاس کا امتحان درجہ اول میں پاس کر کے جوئیر ٹریفیکٹڈ

۵. جی ٹیچر کی سند لے کر نکلا۔۔۔۔۔

پرنسپل صاحب آپ سے بہت خوش تھے۔ اس لئے انھوں نے آپ کو ٹریننگ کالج کے ماڈل اسکول کا ہیڈ ماسٹر مقرر کر دیا تھا۔ اس زمانہ میں راقم الحروف بھی ٹریننگ کالج سینئر کلاس میں زیر تعلیم تھا۔ ہم سب لوگ یعنی مدرسان، مڈل سکول کالج، ہسٹری میں رہتے تھے۔ اسکور روحانی کشش سمجھنا چاہتے کہ نیرامنشی صاحب سے خاص طور پر تعارف ہوا اور بہت جلد دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے۔ آپ طبعاً بڑے غیور اور ذہین واقع ہوئے تھے۔

ہندوستان میں جو انگریز آتے تھے چونکہ وہ حکمران طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اس لئے پریم چند ان سے نفرت کرتے تھے۔ کہیں بھی اچھے الفاظ میں ان کا ذکر نہیں کیا لیکن اپنی مہولی کی کھٹی ”کہانی میں ایک انگریز کا ذکر بڑے پیار سے کیا ہے۔ کہتے ہیں: ”مسٹر جیکسن سے کئی بار مل چکا ہوں اس کی شرافت نے مجھے اس کا عقیدت مند بنا دیا ہے میں اسے انسان نہیں فرشتہ سمجھتا ہوں“

یہ فرشتہ سیرت انگریز غالباً ٹریننگ کالج کا پرنسپل ہی تھا جو اپنے شاگردوں کا سچا ہی خواہ تھا اس نے پریم چند کے دل میں پڑھنے اور آگے بڑھنے کی تحریک پیدا کی۔ ان کے اس دور کے متعلق کچھ روشنی منشی دریا نارائن نگم ایڈیٹر زمانہ نے بھی ڈالی ہے انھوں نے لکھا ہے :-

”انھوں نے اپریل ۱۹۰۲ء میں جو نیر اننگلش ٹیچرس سرٹیفکیٹ کا امتحان اول درجہ میں پاس کیا۔ اس کے سرٹیفکیٹ موزعہ یکم جولائی ۱۹۰۲ء میں جس پر مہر جی سی کمپٹر پرنسپل اور مسٹر میکن انسپکٹر مدراس الہ آباد سرکل کے دستخط ہیں عبارت ذیل قابل ذکر ہے۔

NOT QUALIFIED TO TEACH.

MATHEMATICS CONDUCT SATISFACTORY AND REGULAR. HE WORKED EARNESTLY AND WELL.

(یعنی متقی نے اس سرٹیفکیٹ میں صاف لکھ دیا ہے کہ ریاضی پڑھانے کی قابلیت نہیں ہے۔ مگر چال چلن قابل اطمینان رہا۔ اور وہ پابندِ اوقات بھی رہے اور اپنا کام جانفشانی اور خوبی سے کیا۔)

۱۹۰۳ء میں قدیم الہ آباد یونیورسٹی کا پرنسپل ورنیکلر امتحان بھی اُردو، ہندی دونوں میں پاس کیا۔ انٹر میڈیٹ کا امتحان کئی بار دیا۔ لیکن ہر دفعہ ریاضی میں ناکامیاب رہے۔ آخر جب یہ مضمون لازمی نہیں رہا اور اختیار ہو گیا تو ۱۹۱۰ء میں سیکنڈ ڈویژن میں اسکو بھی پاس کر لیا۔ اس وقت وہ گورنمنٹ اسکول میں اسٹنٹ ٹیچر تھے۔ انٹر میڈیٹ میں ان کے مضامین تھے۔

انگریزی۔ منطق۔ فارسی اور زمانہ حال کی تاریخ۔

نوسال کے بعد ۱۹۱۹ء میں جب گورکھپور میں پھر تھے تو الہ آباد یونیورسٹی کا امتحان بی۔ اے بھی سکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ اس مرتبہ ان کے سبکدست یہ تھے۔
انگریزی۔ فارسی۔ اور تاریخ۔“

امتحان تو انھوں نے ضرور پاس کئے لیکن وہ امتحان پاس کرنے کے لئے نہیں پڑھتے تھے۔ ان کے نزدیک تعلیم زندگی کی تکمیل کا ذریعہ تھی۔ اس لئے پڑھنے کے لئے امتحان پاس کرتے تھے۔ اور پڑھنے کی لگن کا اندازہ ان کے ... ایک چھوٹے سے اقتباس سے چلتا ہے۔ اپنی فلسفی کی محبت ”کہانی میں لکھتے ہیں بند

”لامہ گوپی ناتھ کی طبیعت دور شباب ہی سے فلسفہ کی جانب مائل تھی وہ انٹرمیڈیٹ کلاس ہی میں تھے کہ مل اور برکلی ان کے نو ب زبان ہو گئے تھے۔“

بابو کرشن لال نے اپنے مضمون کو جاری رکھتے ہوئے لکھا ہے :-

”علشی پریم چند ابتداء ہی سے کتب بینی کے بہت شائق تھے۔ چنانچہ ایک روز

میرے ساتھ مسٹر سجدانند سہنبایر سٹر سے ملاقات کی تاکہ وقتاً فوقتاً ان کے کتب خانہ سے فائدہ اٹھاتے رہیں۔ ایک مرتبہ انھیں سے مولوی ذکرا اللہ صاحب کی تاریخ

لے آئے۔ اور چند ہی روز میں اس کی تینوں یا چاروں ضخیم جلدوں کو ختم کر ڈالا اور اس غور سے پڑھا جسے اس پر کوئی تنقیدی مضمون لکھا ہے۔“

آگے لکھتے ہیں۔

”جس طرح ان کی وضع قطع سادہ تھی۔ عادتیں اور اخلاق بھی سیدھا سچا اور

تصنع سے بالاتر تھا۔ خلوص آپ کا ہمیشہ سے شعار تھا۔ آواز بلند تھی اور خواہ مخواہ

کسی سے دہنے والے آدمی نہ تھے۔ ہوسٹل میں کسی سے لڑنا جھگڑنا درکنار انھیں کبھی کسی سے نا ملائم یا خلاف تہذیب گفتگو کرتے ہوئے بھی نہیں دیکھا گیا۔ ملازموں کے ساتھ بھی اچھی طرح پیش آتے تھے۔

”بڑھتے لگتے وقت اکثر اپنا کمرہ اندر سے بند کر لیا کرتے اور تفریح کے وقت دل کھول کر تفریح کرتے۔۔۔۔“

فراق گورکھپوری نے بھی ان کے شوق مطالعہ پر روشنی ڈالی ہے کہتے ہیں:-
 ”پریم چند کسی خاص اصول کے ماتحت کبھی کتابیں نہیں پڑھا کرتے تھے اور انھیں زیادہ تر انھیں کتابوں اور ناولوں سے لکھی ہوتی تھی جو رسم و رواج و روایات تاریخی واقعات اور زندگی کے دوسرے نقوش سادہ اور مانوس طریقہ پر پیش کرتی تھیں۔ اس میں وہ اپنے طلب و تحقیق اور ذوق ادب کا پتہ بھی دیتے تھے“

مرزا فدا علی خنجر لکھنوی نول کشور پریس لکھنؤ میں ان کے رفیقِ کار رہ چکے ہیں وہ کہتے ہیں:-

”وہ برائی کہا نہیں اور قصوں کے بے انتہا شائق تھے۔ اکثر راقم الحروف سے فرمائش کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ جب کبھی ان کے مذاق کے مطابق چھوٹی موٹی کتاب مل جاتی تو میں اسے ان کی خدمت میں پیش کر دیتا۔ وہ خوش ہو جاتے اور نہایت ذوق سے پڑھتے۔ جب واپس کرنے لگتے تو اس کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کرتے۔ یہ خیالات ان کی ناقدانہ قوت کا مظہر تھے“

ٹرنینگ کالج کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہیں انھیں ماڈل اسکول

کا ہیڈ ماسٹر مقرر کر دیا۔ لڑکے انھیں ماسٹر دھنپت رائے اور احباب بابو دھنپت رائے کہتے تھے۔ لڑکپن چلا گیا تھا۔ زندگی اور ماحول سے اچھی طرح مانوس ہو گئے تھے۔ اور انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ مدرسہ کرتے ہوئے بھی ان کے لئے آگے بڑھنے کا امکان ہے۔ چنانچہ ”میدانِ عمل“ کا ہیبرامرثیت کہتا ہے :-

”میں اب تک فضول تعلیم کے پیچھے پڑا رہا سکول اور کالج سے الگ رہ کر ہی آدمی بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔“

پہلی تخلیق

لکھتے تو وہ ہیں جن کے دل میں کچھ درد ہے
پریم ہے، لگن ہے، اور گیان ہے۔ جنہوں نے
دولت کو زندگی کا مقصد بنایا ہے وہ کیا کہیں گے؟
(پریم چند)

تعلیم مافی الضمیر کو ادا کر سکنے کی تربیت حاصل کرنے کا نام ہے۔ پریم چند نے
یہ بات ابتداء ہی سے محسوس کر لی تھی اس لئے وہ اتنی مستعدی سے تعلیم کئے بیٹے پر
بھروسے تھے۔ اسی لئے وہ کتابوں کو اتنے غور سے پڑھتے تھے اور ان پر دوستوں سے
بحث و تمحیص کرتے تھے۔ اس تنقیدی شعور کے باعث ان میں بسی رفتہ رفتہ لکھنے
کی صلاحیت پیدا ہو گئی۔

انھیں قصے کہانیاں پڑھنے کا شوق تھا ہی، اور یہ شوق ہمیشہ بڑھتا رہا کیونکہ

یہ قصے کہانیاں ان کی بے کیف اور بے رنگ بوزندگی میں رومان اور رنگ بھرتی
 تھیں ”طلسم ہو شرابا“ اور ”چندر کانت سنتی“ کے تخیلی کردار خارجی واقعات کے غلا
 جدوجہد کرنے پر آمادہ کرتے تھے، قوتِ عمل کو محرک رکھتے تھے اور ان کے رنگ بے
 میں جو حرارت پوشیدہ تھی اسے شعلہ گیر بناتے تھے اس سے ان کے ذہن پر ادب
 کی افادیت نقش ہو گئی۔ اس کے علاوہ انھوں نے زمانہ کا بہت کچھ سرد و گرم دیکھا
 تھا اور حالات نے انھیں حساس و غمور بنا دیا تھا۔ ان کے دل میں بے پایاں جذبات
 موجزن رہتے تھے۔ انھیں زندگی سے انس تھا۔ اور وہ ہمیشہ سوچتے تھے کہ دنیا میں
 میں بھی کچھ کر سکتا ہوں۔ مگر خارجی واقعات ان کے ارمانوں کو کچھ رہے تھے۔ زندگی
 میں جو ناکامیاں ہوتی تھیں انھیں کامرانیوں میں تبدیل کرنے اور نا آسودہ تناؤ
 کے اظہار کا سرٹ ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ تخلیق و تصنیف کی راہ اپنائیں۔ چنانچہ
 اظہار پر عبور حاصل کرتے ہی انھوں نے قصے کہانیاں لکھنا شروع کر دیا۔
 انھوں نے کہانیاں کب سے لکھنا شروع کیں۔ اس کے لئے کوئی دوسری
 سند درکار نہیں۔ خود ان کا اپنا بیان موجود ہے۔ لکھتے ہیں :-

”پہلے پہل ۱۹۰۶ء میں میں نے کہانیاں لکھنا شروع کیں۔ ڈاکٹر رابندر ناتھ
 ٹیگور کی میں نے کئی کہانیاں انگریزی میں پڑھی تھیں، ان میں سے بعض کا ترجمہ
 کیا اور پہلا ناول تو میں نے ۱۹۰۱ء میں لکھنا شروع کیا۔ میرا ایک ناول ۱۹۰۲ء
 میں شائع ہوا اور دوسرا ۱۹۰۴ء میں۔۔۔ لیکن کہانیاں سب سے پہلے ۱۹۰۶ء
 ہی میں لکھیں۔ میری پہلی کہانی کا نام تھا ”دنیا کا سب سے اچھا رتن“ وہ ۱۹۰۶ء
 میں رسالہ زمانہ میں چھپی۔ اس کے بعد میں نے زمانہ میں چار پانچ کہانیاں اور لکھیں“

لیکن ”زمانہ کانپور“ میں انھوں نے اس سے بھی پہلے کہنا شروع کر دیا تھا۔۔
نشی دیا نارائن نغم ایڈیٹر زمانہ کہتے ہیں:-

”سال بھر کے اندر ہی اندر پریم چند جی سے جن کا اصلی نام دھنپت رائے تھا خط و
تابت شروع ہو گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۰۷ء کے آخر تک وہ بھی زمانہ کے قلمی و
نثری شامل ہو گئے۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے آپ نے سب سے پہلے ایک تنقیدی
ضمون ۱۹۰۵ء میں ”زمانہ“ میں شائع ہونے کے لئے اور ایک ناول کا مسودہ ”نغم
شورہ“ بھیجا تھا۔“

۱۹۰۶ء اور ۱۹۰۷ء میں جو دو ناول شائع ہوئے تھے ان کے نام غالباً ”کشتا
ورم خرم“ اور ”م ثواب“ تھے۔ مگر نشی جگیشور ناتھ درمایتاب بریلوی کا کہنا ہے کہ ان
پہلے ناول پر کیا ہے جو ہندی میں شائع ہوا تھا اور اردو میں اس کا نام ”پرتاب چندر“
ہے یہ دھنپت رائے کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ لیکن سچ یہ ہے کہ ان کا پہلا
اول ”م خرم“ اور ”م ثواب“ تھا۔

بہر کیف ”نشی پریم چند“ نے کہانیوں سے پہلے ناول کہنا شروع کیا۔ لیکن ان
ن اوجی زندگی کا آغاز اس سے بہت پہلے ہو چکا تھا۔ جو کہانیاں آدمی دل میں سہج
ہے لیکن لکھ نہیں سکتا۔ وہ بھی تو ذہن پر اپنا اثر چھوڑتی ہیں۔ اور قوت تحقیق کو لرگ
رہاتی ہیں اور ایسی کہانیاں بھی ہوں گی جو ”نشی پریم چند“ نے لکھی تو سہی لیکن شائع
نہیں ہوئیں۔ ”میری پہلی تحقیق“ میں انھوں نے ایک ایسی ہی تحریر کا ذکر کیا ہے:-
”بک مزاحیہ ڈرامہ تھا جو انھوں نے اپنے ماموں کے متعلق لکھا تھا۔“

ان کے ماموں گاؤں میں رہتے تھے۔ موروٹی زمین تھی۔ اس سے کھانے بھر کو

آجاتا تھا لیکن مجرور زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ سماجی رکاوٹوں کے باعث شادی نہیں ہو سکی۔ اس لئے ایک چماری سے جو ان کے گھر میں گوبر پاتھنے اور کوڑا کرکٹ اٹھانے آیا کرتی تھی عشق لڑانے لگے۔ چماری چالاک تھی اس نے سماج کے مظلوم اس آدمی کی کمزوری کو بھانپ لیا۔ ادھر اس سے اچھے اچھے لڑے سیتی اور تریاں کھاتی رہی اور ادھر اس عشق کا چرچا چارلسٹی میں کر دیا۔ اس لئے جس روز ماموں صاحب کو اس عشق کا آخری مرحلہ طے کرنا تھا ان کی خوب مہمت ہوئی۔ چماری کے اندر آتے ہی یوں ہی اٹھوں نے سنا نکل گئی کہ ٹھہ بند چاروں نے دروازہ توڑنا۔ شروع کر دیا۔ وہ خوف کے مارے بھوتے ولے کمرے میں جا چھپے۔ مگر چار اپنی سی کرنے پر تگے ہوئے تھے۔ انہیں اندر سے نکال کر خوب پیٹا۔

سارے گاؤں میں ان کی کھٹی آڑی اور وہاں رہنا مشکل ہو گیا اس لئے وہ بہنئی کے گھر اٹھ آئے۔ اس سے پہلے بھی جب کبھی اکیلے رہتے جی گھبرا جاتا تھا اکثر آجاتے تھے۔ پریم چند کی عمر اس وقت بارہ تیرہ سال تھی۔ وہ ان پر ہمیشہ رعب کا نشانہ کرتے تھے۔ پریم چند کا خیال تھا کہ اس واقعہ کے بعد ماموں صاحب کا رویہ نرم پڑ جائے گا۔ لیکن جب دیکھا کہ ایسا نہیں ماموں صاحب بدستور رعب کا نشانہ ہے ہیں تو انھوں نے اس واقعہ کی بنا پر ایک مزاحیہ ڈرامہ لکھا جس میں چماروں کے ہاتھوں ماموں کی مرگت کا ذکر خوب مزے لے لے کر کیا تھا۔

وہ صبح سکول جاتے وقت یہ ڈرامہ ماموں صاحب کے سر ہلنے رکھ گئے چھٹی صف پر وہ یہ خیال دلیں لئے لوٹ رہے تھے کہ دیکھیں ڈرامہ پڑھنے کے بعد ان پر اس کا کیا رد عمل ہوا۔ لیکن گھر پہنچے تو وہاں نہ ماموں موجود تھے۔ اور نہ وہ ڈرامہ

شاید وہ جاتے وقت ان کی پہلی تخلیق "کو نذر آتش" کر گئے تھے۔

اس سے پریم چند کے افتادہ طبع کا پتہ چلتا ہے وہ بڑے بڑے ہو کر ہمیشہ سوشل برائیوں پر چوٹ کرتے رہے۔ اس کے بعد جب ان کی عمر چودہ سال تھی انھوں نے ایک ڈرامہ اور لکھا جس کا نام تھا "ہو ہنار بروا کے چکنے چکنے پات" یہ نام نطف سے خانی نہیں ان کی ذات پر صادق آتا ہے۔ چار سال بعد ایک ناول "اسرارہ محبت" "آواز خلق" میں شائع ہوا تھا۔ یہ اخبار بنارس سے نکلتا تھا۔

پریم چند کے شروع کے ناول اور افسانے مہرئے ادیب کی تصنیفات کی طرح فنی اعتبار سے اچھے نہیں تھے۔ ان کی عبارت اپنے پیشروؤں کی طرح متعقّب اور متکلف تھی اس پر قصہ چہار درویش "اور رتن ناتھ سرشار کے "فسانہ آزاد" کا رنگ غالب تھا۔ سید علی جوہر زیدی نے منشی پریم چند پر ایک بسیط مضمون میں ان کے اسلوب کی بابت لکھا ہے۔ "جتنے بڑے بڑے لکھنے والے ہیں۔ وہ سب اس کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ ایک انفرادی حیثیت حاصل کریں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر منشی پریم چند کی تصانیف کو اس نقطہ نظر سے نہ دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوگا کہ یہ تمام افسانے ایک ہی شخص کے لکھے ہوئے نہیں بلکہ مختلف مصنفین کے زور قلم کا نتیجہ ہیں کہیں سرشار کا رنگ نظر آئے گا۔ کہیں ایشن نارائن درکا اور کہیں رابندر ناتھ ٹیگور کا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پریم چند کا یہ عقیدہ تھا کہ عبارت اور خیالات میں حتیٰ الوسع ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ جس قسم کے خیالات کا وہ اظہار کرنا چاہتے تھے اس کے لئے ویسے ہی طرزِ ادا کا انتخاب بھی کرتے تھے۔"

ہر ایک ادیب اپنے پیش روؤں اور اہم عسروں سے متاثر ہوتا ہے اور پہلے

اپنی کے رنگ میں لکتا ہے۔ اسلوب میں انفرادیت پیدا کرنے کے لئے تو ایک عرصہ درکار ہے اور اس کے لئے مسلسل اور شعوری کوشش کرنا پڑتی ہے۔ منشی پریم چند کو بھی اس بات کا پورا احساس تھا۔ ایڈیٹر زمانہ کہتے ہیں :-

”۱۹۱۴ء تک وہ اپنے طرز تحریر کے متعلق دبدبے میں تھے۔ چنانچہ ہمارے ۱۹۱۴ء کا خط ان کے دلی خیالات کا آئینہ ہے کہتے ہیں :- ”مجھے ابھی تک یہ اطمینان نہیں ہوا کہ کون سا طرز تحریر اختیار کروں۔ کبھی تو بنکھ کی نقل کرتا ہوں۔ کبھی آزاد کے پیچھے چلتا ہوں۔ آج کل ٹال سٹانی کے قصبے پر غصہ چکا ہوں۔ تب سے کچھ اسی رنگ کی طرف طبیعت مائل ہے۔ یہ اپنی کمزوری ہے۔ اور کیا۔ یہ قصہ جو میں روانہ کر رہا ہوں۔ اس میں لطف تحریر کی مطلق کوشش نہیں کی گئی۔ سید سی سادی باتیں لکھی ہیں۔ معلوم نہیں آپ پسند کریں گے یا نہیں۔“

وہ قصہ کیا تھا معلوم نہیں۔ لیکن ایک بات صاف ہے کہ وہ مقنع اور پر عبارت آراتی سے رفتہ رفتہ سادہ اور بے ساختہ طرز تحریر کی طرف آتے گئے۔ پریم چکیسی اور پریم تپسی اور پریم چالیسی کی کہانیوں میں جو زریں بیان ہے وہ بعد کی کہانیوں میں نہیں رہا۔ بعد میں وہ سادہ مگر زیادہ پراثر اور دلکش ہو گیا۔ دونوں عبارتوں کے نمونے ملاحظہ ہوں۔

طہ جہ اور ثروت، کمال اور شہرت یہ سب سفلی اور مادی ہیں۔ نفیس کی ناز بردار اس قابل نہیں کہ ہم ان کے سامنے فرقِ نیاز جھکائیں۔ نرک اور تسنیم ہی وہ علوی صفات ہیں جن کے آستانہ پر حشمت اور جاہ سے بے نیاز سر بھی جھک جاتے ہیں۔ یہ وہی طاقت ہے جو جاہ و حشم کو بادۂ غرور کے متوالوں کو، اور تاج مرصع کو اپنے قدموں

بزرگرا سکتی ہے۔“ (پریم تپسی حصہ اول، کہانی سر غرود)

اور یہ ایک دوسرا ٹکڑا بعد کی کہانیوں سے درج کیا جاتا ہے۔

”لوگ کہتے ہیں جلوس نکالنے سے کیا ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے ہم زندہ ہیں، مستعد ہیں۔ میدان سے ہٹے نہیں۔ ہمیں اپنی ہار نہ ماننے والی خود داری کا نبوت دینا تھا۔ یہ دکھا دینا تھا کہ ہم تشدد سے اپنے مطالبہ آزادی سے دست بردار ہونے والے نہیں ہم اس نظام کو بدل دینا چاہتے ہیں۔ جس کی بنیاد خود غرضی اور خون چوسنے پر رکھی ہوئی ہے۔“

(کتاب زراوراء، کہانی آشتیاں بریاد)

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ پریم چالیسی کے بعد زبان یک نخت بدل گئی بلکہ پریم بکتی میں جو زبان ہے۔ پریم تپسی میں اس سے آسان ہے اور پریم چالیسی میں پریم تپسی سے آسان ہو گئی ہے۔ اور بعض کہانیوں میں اس کے بعد بھی زبان مشکل بنتی ہے۔ مثلاً بعد کی کہانیاں ”خاک پروانہ“ ”فکر دنیا“ اور ”بڑے بالو“ خاک پروانہ نام کے مجموعہ میں درج ہیں ان کی زبان کافی مشکل ہے جس کا سبب کہانیوں کا موضوع ہے اور اس کے برعکس ان کے مقابلہ میں پریم تپسی حصہ اول کی کہانی ”پنچائت کی زبان کافی آسان ہے۔ ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

دھکھٹہ بھر کے بعد، جمن شیخ الگو چودھری کے پاس آئے اور ان کے گلے سے لپٹ کر بولے۔ ”بھیا جب سے تم نے میری پنچائت کی ہے۔ میں دل سے تمہارا جانی دشمن تھا۔ مگر آج مجھے معلوم ہوا کہ پنچائت کی سند پر بیٹھ کر نہ کوئی کسی کا دوست ہوتا ہے اور نہ دشمن انصاف کے سوا اور اسے کچھ نہیں سوچتا۔“

ظاہر ہے کہ موضوع اسلوب پر انرا انداز ہوتا ہے مثلاً پریم چند جوں جوں عوام کے قریب آتے ان کی طرزِ تحریر صاف اور عام فہم ہوتی گئی۔ جب انھوں نے اُلگو اور ہری دھن یا شیخ جمن کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا تو ان کی زبان بھی اپنا نا ضروری تھی۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ مگنودان میں انھوں نے بہت ہی آسان زبان استعمال کی ہے۔ اور اس سے پہلے پریم آشرم کی زبان بھی ہندی اور اردو دونوں میں سمجھی جاسکتی ہے۔ کیونکہ وہ کسانوں یعنی عام لوگوں کی زبان پر شروع میں جب وہ طلسمی کہانیوں کی زبان استعمال کرتے تھے تو ان کی اپنی کہانیاں جی ایک طرح طلسمی ہوتی تھیں اور ان میں مافوق الفطرت واقعات کی بھرمار تھی۔ ان کا پلاٹ بھی پریوں کی کہانی کی طرح عجیب اور واقعات کی جھڑ سے پر ہوتا تھا۔ مثلاً ان کی ایک کہانی ”نیک بختی کے تاربانے“ ہے اس کا پلاٹ یہ ہے کہ راتے بھولانا تھر لکھنؤ کے بہت بڑے رئیس ہیں۔ نتھو اتامی ایک لڑکا ان کا ملازم ہے جو ان کی کمرن لڑکی رتنا کے کمرے کی صفائی کرتا ہے اور کبھی کبھی اس کے ساتھ کھیلتا بھی ہے۔ ایک دن نتھو کے جی میں نہ جانے کیا آئی کہ وہ رتنا کے پلنگ پر چادر تان کر سو گیا۔ راتے صاحب نے کہیں اسے یہ حرکت کرتے دیکھ لیا۔ بس پھر کیا تھا غصے کے مارے آپے سے باہر ہو گئے اور کوڑے مار مار کر غریب نتھو کی چمڑی اچھڑ دی۔

اس کے بعد واقعات یوں چلتے ہیں کہ نتھو اٹھنگیوں کی ایک بستی میں جا کر رہنے لگا وہاں گانا بجانا سیکھا اور اتنا ماہر ہو گیا کہ گوالیار کی ایک موسیقی کا نفرین میں اپنی قابلیت کا لوہا منایا اور سکول میں داخل ہو گیا۔ وہاں سے موسیقی کی سب سے اونچی سند حاصل کی اور اپنے استاد کے ساتھ یورپ کے سفر پر چلا گیا۔ وہاں

مغربی موسیقی میں دسترس حاصل کی اور لوٹ کر ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کا دورہ کیا۔ اب اسے عالمگیر شہرت حاصل تھی اور ہر جگہ سوائت ہوتا تھا وہ کہنہ بھی آیا۔ رتنائے پھول مالا پہنائی اور آخر اسے جھولانا تھرنے اپنی لڑکی رتنائی شادی ننھو رام میوزک ماسٹر سے کر دی۔

گویا یہی شکست کی فتح تھی۔ منشی پریم چند کو زندگی میں جن شکستوں سے دوچار ہونا پڑا تھا انھیں وہ تخیل کے زور سے فتح میں تبدیل کر رہے تھے اور اپنی کہانیوں کے ذریعہ اپنی۔۔۔ آدمی کی جدوجہد کو آگے بڑھا رہے تھے۔

بعد میں بھی ان کی کہانیوں اور ناولوں میں مافوق الفطرت واقعات اکثر آتے ہیں اور وہ انھیں شعوری طور پر لاتے ہیں اور ان کے لئے جوابدہ بن کر رہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایڈیٹر ”زمانہ“ نے ایک واقعہ تحریر کیا ہے۔

”کرمی عبداللہ یوسف علی صاحب نے ۱۹۱۵ء میں لکھا تھا کہ پریم چند سے میری طرف سے کہہ دیجئے کہ میں ان کی طرزِ تحریر کا بڑا مداح ہوں۔ لیکن انھیں ایسے قسطے اور ناول لکھنا چاہیے جن سے قومی جذبات کی نشوونما میں مدد ملے اور فوق العادہ واقعات سے پاک ہوں۔ اس کا جواب انھوں نے یہ دیا کہ ”مسٹر عبداللہ کی رائے پر عمل کروں گا۔ حالانکہ

SUPER NATURAL ELEMENT آدمی کی زندگی میں شامل ہے۔

بیشک مافوق الفطرت عناصر آدمی کو گھٹی میں ملے ہیں۔ وہ بہت ہی عجیب و غریب خواب دیکھتا ہے اور خواب دیکھنا اس کے لئے مفید بھی ہے۔ ”الف لیلا“ کے انسان نے جو محلاتِ الدین کے چراغ کی مدد سے بنائے تھے وہ اب اس نے اپنی

دیباچہ، میرے بہترین فنانے بنارس اگست ۱۹۳۳ء

اسی دیباچہ میں اپنے اس نظریہ کی مزید وضاحت کی ہے۔

”پرانی قصے کہانیاں واقعاتی تخیل کی دیکھی سے دلکش ضرور ہیں۔ لیکن ان میں اس رس کی کمی ہے جو پڑھ لکھے نوک ادب میں کھو جتے ہیں۔ اب ہمارے قارئین کچھ ترقی پسند ہو گئے ہیں۔ وہ دوسری صنعتوں کی مانند ادب میں بھی جدت اور ترقی تلاش کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ اب ہم کسی راہ کی غیر معمولی بہادری یا رانی کا ہول کے دوش پر اڑ کر راہ کے قریب پہنچنے یا جنوں جھوٹوں کے من گھڑت قصوں سے خوش نہیں ہوتے۔ ہم انھیں موزوں کانٹے پر تولتے ہیں اور ذرا بھی وزن میں کم ہونے پر قبول نہیں کرتے۔ آج کے افسانے اور ناول میں غیر فطری باتوں کی نگارشات نہیں ان میں ہم اپنی زندگی کا عکس دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے ایک ایک فقرہ اور ہر کردار کی حقیقت کے جامہ میں دیکھنے کے خواہشمند ہیں۔ اس میں جو کچھ بھی لکھا جاتے وہ اس طرح ہر کوئی معمولی ذہانت کا آدمی بھی اسے حقیقت تصور کرے۔ جو کچھ فطری ہے وہ حقیقت ہے اور فطرت سے پرے ہٹنے پر آرمٹ اپنی خوبصورتی اور عادات کو دیتا ہے اسے دوچار فن کا رہی سمجھ سکتے ہیں۔ عوام کے ذہن پر چھانے کی صلاحیت اس میں نہیں رہتی۔“

پریم چند بھی جب عوام کے زیادہ قریب ہو کر عوام کے لئے لکھنا تو ان کی کہانیاں اور ناولوں میں مافوق العادت واقعات نہیں رہے، ویسے تسلیت کے تازیانے کہانی پریوں کی کہانی سے مشابہ ضرور ہے لیکن ہیر ورتنا کے پانگ تکت پہنچنے کے لئے جو کوشش کرتا ہے اور اسے جو واقعات درپیش آتے ہیں وہ عجیب اور کسی

قدرِ تحریر انگیز ضرور ہیں لیکن غیر فطری نہیں ہیں۔

در اصل کہانی کا جنم آدمی کے شوقِ طلب سے ہوا ہے۔ دنیا کے ابتداء میں اس نے سوچا کہ بادل کیوں گر جاتا ہے؟ بھونچال کیوں آتا ہے؟ اور اس کے محدود ذہن اور تخیل نے اس کیوں؟ کا جو جواب دیا وہ کہانی بن گیا۔ جوں جوں اس کا علم اور تجربہ وسیع ہوتا گیا۔ کہانی میں بھی وسعت پیدا ہوتی گئی۔ یعنی کہانی کی اصل اس کی تفصیل نہیں بلکہ آدمی کا تجسس ہے۔ پریم چند نے یہی بات اچھی ایک کہانی کے ہیرو کے بارے میں لکھی ہے۔ ”اس کے مضامین میں طوں کم اور تفتیش زیادہ ہوتی ہے۔“

پریم چند کی کہانیوں کی بنیاد بھی تفتیش ہے۔

کانپور میں

ہم عالمگیر وسیع عظمت کا ایک جزو ہیں۔ جن میں
کل کا وصف ہونا لازمی ہے اس لئے شہرت اور
عزت روحانی ترقی اور تعلیم کی طرف ہمارا فطری حجاب

(پریم چند)

ٹریننگ کالج الہ آباد کے ماڈل سکول سے تباہیل ہو کر پریم چند ۱۹۰۵ء میں
کانپور آ گئے اور یہیں سے دراصل ان کی ادبی زندگی کی ابتداء مہر تھی ہے، منشی -
دیانا راتن نگم ایڈیٹر زمانہ سے پہلے ہی ان کی راہ و رسم ہو گئی تھی کیونکہ ۱۹۰۲ء میں
انھوں نے اپنا ایک تنقیدی مضمون ”زمانہ“ میں شائع کر دیا تھا اور نگم صاحب سے
خط و کتابت شروع ہو گئی تھی -

منشی دیانا راتن نگم بہت ہی شریف اور نیک واقع ہوئے تھے اور نہایت -

غلوں اور محنت کے ساتھ زمانہ کی ایڈیٹری کے فرائض ادا کر رہے تھے وہ سمجھتے تھے کہ ایڈیٹر کا فرض ادب کو سنوارنا اور وسعت دینا ہے۔ جہاں اسے پڑھنے والوں کا حلقہ وسیع کرنا ہوتا ہے وہاں نئے اور ہونہار ادیبوں کی حوصلہ افزائی کرنا بھی اس کا فرض ہے وہ اپنے اس فرض کو بدرجہ اتم نبھا رہے تھے۔ وہ نئے لکھنے والوں کے ساتھ جھٹ دوستانہ تعلقات قائم کر لیتے تھے۔ میں اپنے تجربہ سے ان کی حوصلہ افزائی اور انسان دوستی کا قائل ہوں ۱۹۳۸ء میں میں نے انہیں اپنا ایک افسانہ ”پچھتاوا“ بھیجا۔ پہلے ان سے مطلق جان پہچان نہیں تھی۔ اور میری افسانہ نگاری کی ابتدا بھی انہوں نے نہ صرف وہ افسانہ ”زمانہ“ میں شائع کیا بلکہ فوراً ہی ایک خط لکھ کر کامیاب افسانہ لکھنے پر مبارکباد پیش کی اور متواتر لکھتے رہنے کا تقاضا کیا۔ پھر جب تک جوم زندہ رہے ان سے خط و کتابت رہی۔ انہوں نے نہ صرف ہمیشہ حوصلہ افزائی کی بلکہ نیک مشورے بھی دیئے۔

یہ ایک جملہ معترضہ تھا جو اس لئے درج کر دیا گیا کہ پریم چند کے ساتھ ان کے تعلقات سمجھنے میں مدد ثابت ہوگا۔ انہوں نے پریم چند کے جوہر کو پہچان لیا اور اسے سنوارنے اور نکھارنے میں حتی الوسع ان کی مدد کی۔ بعد ازاں اس کی خط و کتابت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کی زندگی کا ایک حصہ بن گئے تھے گو عمر میں پریم چند سے چھوٹے تھے مگر پریم چند انہیں بڑے بھائی کی طرح مانتے تھے اور زندگی کے ہر معاملہ میں ان سے مشورہ طلب کرتے تھے۔

پریم چند کی وفات پر منشی دیانارائن نل نے ایک مضمون بعنوان ”پریم چند کی باتیں“ زمانہ میں تحریر کیا تھا۔ اس کا شروع کا ٹکڑا ہی ان کے باہمی تعلقات پر بخوبی

روشنی ڈالتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

”میرے لئے منشی پریم چند کے متعلق کوئی مدلل و مفصل مضمون لکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے ان کا خیال آتے ہی ساہا سال کی سینکڑوں پرانی باتیں یاد آنے لگتی ہیں اور میں ان میں گم سا ہو جاتا ہوں۔

تیس سال کے قریب میرا ان کا دوستانہ نہیں بلکہ حقیقی طور پر برادرانہ تعلق رہا۔ قہنی طور پر ہم دونوں ہر معاملے میں ہم خیال نہیں تو ایک دوسرے کے بڑے ہمدرد ضرور تھے۔ اور وہ اکثر اصولی و ضروری باتوں میں میری رائے کو بڑی وقعت دیتے تھے۔

عجیب بات ہے کہ گو وہ عمر میں مجھ سے کچھ بڑے تھے۔ لیکن شروع سے آخر تک وہ مجھے بڑے بھائی کی طرح سمجھتے رہے۔ جن دنوں ہر وقت کی بے تکلفی اور سہنسی۔ دل لگی رہتی تھی۔ اس وقت بھی وہ میری باتوں کی بڑی قدر کرتے تھے اور میرا بہت کاظم رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ میرے عزیزان کے عزیز اور میرے احباب ان کے احباب ہو گئے، مجھے بھی ان کے کسی معاملے میں دخل دینے میں کبھی پس و پیش نہیں ہوا۔ بہت سے امور میں تو جو میری رائے ہوتی اس پر وہ کاربند ہوتے تھے۔“

پریم چند جب ۱۹۰۵ء میں کانپور آئے تو عرصہ تک منشی دیانارائن نگم کے ساتھ ایک ہی مکان میں رہے اور پھر قریب ہی دوسرا مکان کرلیہ پر لے لیا۔ اور ۱۹۰۸ء تک وہاں رہائش پذیر رہے اس کے بعد ان کا تبادلہ ہمیر پور میں گیا اور وہ کانپور سے چلے گئے۔ لیکن یہ تین سال کا مختصر زمانہ بہت ہی رنگارنگی کا زمانہ تھا۔ زمانہ کے دفتر میں خوب ادبی محفلیں ہوتی تھیں، خوب تنقیدیں نکالی جاتی

تھیں۔ اس کا ذکر منشی دریا نارائن نگم نے اپنے مضمون میں یوں کیا ہے
 ”کئی سال تک ایک ساتھ رہنے کا اتفاق رہا اور یہ میری زندگی کا بہترین
 زمانہ تھا۔ پریم چند کو بہت رلے نظر اور درگا سہائے سرور اور کئی احباب و اہل
 شام کے وقت دو تین گھنٹے کے لئے ایک جا ملو جاتے اور زندگی کا کوئی مرحلہ اور
 دین و دنیا کا کوئی مسئلہ یا ان بے تکلف کے غور و فکر سے محفوظ نہ رہتا۔ واقعاتِ عالم
 پر بحثیں ہوتیں۔ ہر معاملہ پر رز و کد ملتی۔ ہر مسئلہ کی چھان بین کی جاتی۔ ایک
 دوسرے کی نکتہ پیمانی ہوتی خوب مذاق ہوتا۔ تھقے پر تھقے اڑتے۔“

پریم چند بہت ہی خوش خلق اور ہنسار واقع ہوتے تھے۔ سب دوست
 ان کی شرافت اور بذلہ سخی کے قائل تھے۔ باتیں کرنے اور دوستوں کا جی بہانے
 کا انھیں خاص ملکہ حاصل تھا۔ منشی پیارے لال شا کر میہ ٹھی کو بھی ان دنوں کانپور
 آئے اور پریم چند کی دوستی کا شرف حاصل ہوا تھا۔ وہ پریم چند سے اپنی پہلی ملاقات
 کا ذکر یوں کرتے ہیں۔

”منشی پریم چند سے میری پہلی ملاقات کانپور ریوے اسٹیشن پر جون ۱۹۰۶ء
 میں ہوئی تھی۔ میں بنوں (صوبہ سرحد) سے منشی دریا نارائن نگم کا طلبیدہ کانپور
 آ رہا تھا۔ اور وہ میرے استقبال کو اسٹیشن پر آئے تھے۔ میں سامان اتروانے کی
 غرض سے بریک کی طرف چل دیا۔ اور میری بیوی بچے ایک طرف پلیٹ فارم پر
 ٹھہرے ہو کر میرا انتظار کرنے لگے۔ منشی صاحب ادھر ادھر نظر مارتے ہوئے نہیں آنکھ
 اور میری بیوی سب بچوں کے باپ کا نام دریافت کیا۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ وہ
 میرے ہی بچے ہیں تو بڑے تپاک سے ملے اور ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی

تھوڑی دیر کے بعد میں آیا تو میری بیوی نے اُن کا تعارف کر دیا کہ آپ فنی
نواب رائے ہیں کچھ دیر تو پلیٹ فارم پر ہی باتیں ہوتی رہیں۔ بعد ازاں باہر نکل
کر گاڑی پر سوار ہو گئے۔ اسٹیشن سے نیا چوک کافی دور ہے۔ لیکن پریم چند کی وجہ
سے ددوی مطلق محسوس نہ ہوئی۔ وہ راستہ بھر بے تکلفی سے باتیں کرتے رہے۔
گو باپرائے ملنے والے ہیں۔
شاگرد صاحب آگے لکھتے ہیں :-

ٹکا پور میں کم و بیش ڈیڑھ سال تک میرا اُن کا ساتھ رہا۔ قریب قریب
ہر روز ملاقات ہوتی رہی، اور اپنے دکھ درد کی بات ایک دوسرے سے کہتے
تھے۔ ان کی طبیعت میں حد درجہ انکسار اور استغنا تھا۔ اگرچہ خود بھی خوش حال
نہ تھے، مگر دوسروں کی تکلیف کا اس قدر احساس تھا کہ فوراً مدد کو تیار ہو جاتے تھے
نصیح سے ان کو نفرت تھی اور صاف دلی وصاف گوئی شیعہ۔ حد درجہ بزرگ سنج
اور ظریف الطبع تھے، ہمیشہ قہقہہ مار کر ہنستے تھے اور اس زور سے ہنستے
تھے کہ دیکھنے والے کو بھی ہنسی آ جاتی تھی۔

ان کے انکسار، سادگی، مفارمی میں آگے چل کر بھی کوئی فرق نہیں آیا
سن ۱۹۳۷ء میں جب وہ لکھنؤ میں مادھوری کے ایڈیٹر تھے۔ ہندی کے افسانہ
نگار جتیندر کمار جین ان سے وہاں ملنے گئے۔ گاڑی صبح صبح جاتی تھی پریم چند
قیصر باغ میں ایک مکان کی اوپری منزل میں رہتے تھے جنہیں سذر نے مکان پر
نیچے سے آواز دی۔ فوراً جواب ملا اور دھرتی کرتے میں ملبوس کچھ بے بالوں والا
ایک پتلا ڈبلا آدمی نیچے آیا اور انھیں اوپر لولے گیا اور انھیں ایک کمرے

میں بٹھا کر خود ہانے دھونے کا انتظام کرنے چلا گیا۔ اس بیچ میں جنیڈرکار نے پریم چند کے بڑے لڑکے شری پت لائے سے کہا :

”پریم چند جی کو بلائیے۔ میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں“

”آپ ہی تو تھے“

لڑکے نے جواب دیا، اور جنیڈرکار حیران رہ گئے۔ انھیں اپنے آپ پر ششواش نہیں آتا تھا۔

پریم چند کی رواداری، مروت اور دوستوں سے سلوک کے متعلق دیانند گم نے کافی کچھ لکھا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو :-

”دوستوں سے سلوک ہونا چاہتے تھے اور جہاں تک ہو سکتا تھا لوگوں کی حاجت روائی کرتے تھے۔ مگر اس میں کبھی تکلیف ہو جاتی تھی جیسا کہ معمولی ذرائع رکھنے والے ہر دوست نواز اور ہمدرد انسان شخص کو بار بار تجربہ ہوا ہو گا۔ انھیں بھی خلاف توقع نقصان پیش آجاتے تھے، اور وہ بہ تعاقباً بشریت کبھی کبھی دل میں پھبتانے لگتے تھے اور خود ہی نکتہ چینی کرنے لگتے تھے چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں :

”ایسے موقع بھی آئے ہیں جب دوستوں کی خاطر اپنے اوپر انتہائی جبر کرنے پڑے ہیں۔ لیکن میں نے اپنی اصلی حالت کو ان پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اور انھیں یہ بھرم رہا کہ میں کوئی متول آدمی ہوں۔ فضول خرچی سے مجھے آشنائی نہیں، لیکن متول کا اظہار مجھے پہنچنے نہیں دیتا“

داصل یہ متول کا اظہار نہ تھا بلکہ انسانی غیرت اور دوسروں کے ساتھ ہمدردی

حسن سلوک سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کتنے بڑے انسان تھے اور یہی اُن کے بڑے ادیب بننے کی دلیل ہے اور ادیب میں ان کی عظمت کو سمجھنے کے لئے زندگی کے اسی پہلو کو سمجھ لینا ضروری ہے۔

کامپوزر میں انھوں نے بہت کچھ سیکھا۔ پڑھنے کا شوق انھیں پہلے ہی تھا یہاں اس شوق کو اور آگے بڑھانے اور اپنے خیالات کو سانچے میں ڈھلنے کا موقع ملا، اور ان کا مطالعہ ہمہ گیر ہوتا گیا۔ اور شاکر صاحب میسر ٹھی لکھتے ہیں :-

”منشی پریم چند کو مطالعے کا بہت شوق تھا۔ شاید ہی کوئی ایسا موضوع ہو جس پر ایک آدھ کتاب اُن کی نظر سے نہ گزری ہو۔ اس کے ساتھ ہی حفظ بلا کا تھا۔ قصے کہانی کی کتابیں پڑھنا اور انھیں یاد رکھنا تو کوئی قابلِ تعریف بات نہیں لیکن منشی پریم چند علمی و سیاسی کتب و رسائل کے اہم مطالب اس طرح دہرا دیا کرتے گویا پڑھ کر سنا رہے ہوں۔ سیاسی معاملات میں ان کا دماغ خوب کام کرتا تھا۔ رسالہ زمانہ میں اہم سیاسی واقعات و حالات پر ایک ماہانہ تبصرہ ”رفقار زمانہ“ کے نام سے شائع ہوا کرتا تھا۔ یہ تبصرہ زمانہ کی خصوصیات میں تھا اور لوگ توجہ و شوق سے اس کو پڑھتے تھے۔ ۱۹۰۷ء کے بعض تبصروں کا بڑا جزو منشی پریم چند ہی لکھتے تھے۔ انھوں نے بعض کتابوں پر تنقیدیں بھی لکھیں، اور وہ تنقیدیں زمانہ کی بہترین تنقیدوں میں شمار کی جاسکتی ہیں۔“

سید علی جواد زبیری لکھتے ہیں :-

”کانپور میں پریم چند کو خدا داد صلاحیتوں کے استعمال کے کافی موقع حاصل ہوئے ”آزاد“ اور ”زمانہ“ کے صفحات ہمیشہ اُن کے لئے کھلے رہے اور اسی مشق نے انھیں ادارت کے تمام مبادیات اور اصولوں سے واقف کر دیا۔

”آزاد“ منشی دیانرائن نغم کا ہفتہ وار اخبار تھا جو ”زمانہ“ ہی کے دفتر سے نکلتا تھا۔ پریم چند ان دنوں ”نواب رائے“ کے نام سے لکھتے تھے۔

مضمون لیبی کا انھیں زیادہ شوق نہیں تھا۔ لیکن منشی دیانرائن نغم کی صحبت اور حسن سلوک انھیں زیادہ لکھنے کی طرف مائل کرتا رہا۔ جب منشی دیانرائن نغم سے ان کے اتنے گہرے تعلقات ہو گئے تھے تو یہ دونوں پرچے بھی ایک طرح ان کے اپنے ہی تھے۔ اس لئے ان کے لئے لکھنا ضروری تھا۔ پریم چند سے اپنے تعلقات کی ابتداء کا ذکر کرتے ہوئے منشی دیانرائن نغم لکھتے ہیں..... دوسری سال کے بعد آپ کا تبادلہ گورنمنٹ ہائی اسکول کانپور میں ہو گیا..... اس طرح بے ضابطہ حیثیت سے آپ کو ”زمانہ“ کی اسٹنٹ ایڈیٹری کی پوزیشن حاصل ہو گئی۔“

اس بے ضابطہ اسٹنٹ ایڈیٹری نے پریم چند کو بہت کچھ سکھایا یہاں انھوں نے جو کچھ لکھا وہ آج ان کے ادب کا حصہ بے شک نہ ہو لیکن یہ ان کی شخصیت کا اہم حصہ تھا۔ انھوں نے یہاں جو محنت کی اس سے اُن کی سیاسی اور سماجی واقفیت بڑھی۔ شعور میں پختگی اور وسعت پیدا ہوئی اور انھوں نے بہت بڑی بات کو اختصار سے کہنا سیکھا۔ یہ ایک ادیب کی زندگی میں بہت بڑی بات ہے۔ جب تک جذبات کی ادائیگی پر عبور حاصل نہ ہو، سیاسی

اور سماجی شعور بچتہ نہ ہو، کوئی ادیب، ادیب کہلانے کا دعوئے نہیں کر سکتا۔
 پریم چند میں ہمیں جو جہاں تہاں دلکش محاورے اور فقرے
 (GENERALIZATIONS) ملتے ہیں وہ اس محنت کا نتیجہ ہیں۔

عام عادات کے بارے میں منشی دیا نرائن نگم لکھتے ہیں کہ پریم چند
 کھانے پینے میں پرہیز کے عادی نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ضعفِ معدہ کی شکایت
 کا کامیابی سے مقابلہ نہ کر سکے۔ غذا کے متعلق ان سے دیر تک کوئی پابندی
 نہ ہوتی تھی، انہوں نے اسی تحریک پر بد پرہیزی کر بیٹھتے تھے۔

مزاج بھی کبھی کبھی متدین ہو جاتا بعض اوقات فدا سی بات مرضی کے
 خلاف ہو جانے پر مدلول خاطر ہو جاتے تھے۔ لیکن اگر دوسرے شخص نے اپنی
 غلطی مان لی یا ان کے رفعِ ملامت کی ذرا سی بھی کوشش کی تو پھر ذرا پالی ہو جاتا
 تھے۔ جب انھیں یہ خیال ہوتا کہ دوسرے کو ان کی کوئی پروا نہیں تو ان کے
 دل پر ضرور ٹھیس لگتی تھی۔

”ادائلِ عمر کے واقعات اور تجربات کی بنا پر پریم چند نے زندگی کے
 مسائل اور ضروریات کے متعلق کچھ خاص نظریے قائم کر لئے تھے.....
 شروع میں ان کے اصول اتنے نمایاں نہ تھے لیکن عمر کے ساتھ یہ نظریے
 ان کی تحریر و تقریر اور ہر ہر بات میں دخل پانے لگے۔“

بمبوق

زندگی کو شکھی بنانا ہی عبادت

اور نجات ہے۔ اگر تم ہنس نہیں سکتے

زندہ نہیں سکتے تو تم انسان نہیں ہو۔ (پریم چند)

ماں باپ نے پریم چند کا نام دھنپت رائے رکھا۔ یہ عام دستور رہی
 کوئی خاص بات نہیں۔ سبھی لوگ اپنے بچے کا ایک نام رکھتے ہیں۔ لیکن جب
 یہ نام سب کی زبان پر چڑھ جاتا ہے تو ماں باپ اپنا پیار جتانے کے لئے کوئی
 اور نام رکھ لیتے ہیں۔ چنانچہ منشی عجائب لال بھی اپنے بیٹے دھنپت رائے
 کو پیار سے ”نواب“ کہا کرتے تھے۔ دھنپت رائے نے بعد ازاں اسے
 اپنا قلمی نام بنایا اور وہ ایک عرصے تک ”نواب رائے“ کے نام سے لکھتے

رہے۔ اور بعد ازاں پریم چند بن گئے۔ لیکن اس کے علاوہ ان کا ایک اور نام بھی تھا جو انھیں دوستوں نے دیا تھا، اور دوست جزام دیتے ہیں وہ بہت سوج ستھج کر دیتے ہیں۔ اس کی ایک داستان ہوتی ہے اور وہ نام آدمی کی پوری شخصیت کا اظہار کرتا ہے۔

پریم چند کا یہ نام تھا ”مبوق“ یہ نام کیسے پڑا؟ اس کی داستان اُن کے ہم سبق اور دوست بابو کرشن لال نے یوں بیان کی ہے :-

»..... پڑھتے لکھتے وقت اکثر اپنا کمرہ اندر سے بند کر لیا کرتے تھے اور تفریح کے وقت دل کھول کر تفریح کرتے۔ آپ کی اور مرحوم بابو گر جاکشور صاحب اسسٹنٹ کمشنر آبکاری کی وجہ سے ہمارا ایک چھوٹا سا لافنگ کلب (LAUGHING CLUB) بن گیا تھا جس کا روزانہ اجلاس میرے ہی کمرے میں ہوا کرتا تھا۔ اس میں شاید اور بھی دو ایک صاحب تھے۔ لیکن اس وقت خیال نہیں آتا، لیکن بہر حال ان میں سبھی ہنسنے والے تھے۔ مگر دھنپ رائے غضب کرتے تھے۔ جب ہنسنے تو خوب ہنسنے اور قہقہے پر قہقہے لگاتے چلے جاتے۔ اسی وجہ سے ہم لوگ خاص کر یہ احقر اور گر جاکشور انھیں ”مبوق“ کہا کرتے تھے۔ اور ممکن ہے یہ لقب میرا ہی اختراع ہو۔ اکثر اسی نام سے راقم کی اُن سے خط و کتابت بھی ہوا کرتی تھی؟

یہ ان دونوں کا ذکر ہے جب پریم چند ٹریننگ کالج الہ آباد میں تعلیم پانے

لے مبوق کا مطلب ہے بہت ہنسنے اور قہقہے لگنے والا

تھے۔ منشی پیارے لال شاہ کا پور کا واقعہ بیان کرتے ہیں :-

”_____ تصنع سے ان کو نفرت تھی اور صاف دلی وصف گوی

شیوہ، حد درجہ زندہ دل، بزرگ سیخ اور ظریف الطبع تھے ہمیشہ تہمت مار کر ہنستے تھے اور اس زور سے ہنستے تھے کہ دیکھنے والے کو بھی ہنسی آ جاتی تھی ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ منشی دیانرائن سنگ کے ہاں مخصوص احباب جمع تھے۔ منشی زور سے نظر، منشی پریم چند اور راقم الحروف بھی موجود تھے۔ قریب ہی کسی چھت پر گر لہو میں برٹ سپر ڈکا مشہور لافنگ سونگ SAT IN A CORNER بجنے لگا، کچھ دیر تو منشی پریم چند خاموش رہے، پھر یہ کہہ کر کہ لیجئے میں بھی اس تہمت میں اس کا ساتھ دیتا ہوں، تہمت مارنے لگے۔“

یہ تہمت کچھ بے تکلف دوستوں اور لمبا عرصہ ساتھ رہنے والوں کے لئے ہی مخصوص نہ تھے بلکہ جس آدمی کو ان سے پہلی مرتبہ ملنے کا اتفاق ہوتا تھا وہ بھی ان کی درجن مریخ طبیعت سے بخوبی واقف ہو جاتا تھا۔ وہ ذرا موقع ملتے ہی آدمی کے سنان گوشوں کو اپنے زعفرانی تہمتوں سے بھر دیتے تھے اور ملاقات کے بعد ہر شخص یوں محسوس کرتا تھا جیسے اس کی زندگی میں کسی غیر معمولی شگفتگی کا مستقل طعیر پر اضافہ ہو گیا ہو۔

پنڈت بنارس داس چٹویدی سابق ایڈیٹر "نیل بھارت" نے ان سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر یوں کیا ہے :-

مجھے سب سے پہلے ۱۹۲۷ء میں پریم چند جی سے ملنے کا لکھنؤ میں اتفاق ہوا۔۔۔۔۔۔ اس وقت وہ "لنگ بھومی" نامی ناول لکھ رہے تھے مگر

انہوں نے مجھے کافی وقت دیا۔ ہم دیر تک مختلف ادبی مسائل پر گفتگو کرتے رہے۔ جرات اُن کی مجھے سب سے زیادہ پسند آئی، وہ یہ بھی کہ اُن کی مزاج تکلف اور تصنع سے قطعی پاک تھا..... انہیں اپنے ملنے والوں تکلف برطرف کرنے کا خاص ملکہ تھا۔ تھوڑی سی دیر کی بات چیت میں ان کے ملنے والے ان کی دوستی اور رفاقت کا دم بھرنے لگتے تھے۔

اس کے بعد مجھے ۱۹۳۲ء میں ان سے بنارس میں ملنے کا اتفاق ہوا اور دو دن تک انہیں کے مکان پر قیام رہا۔ اس لطفِ صحبت کو میں تمام زندگی نہ بھول سکیں گا۔“

اور بعد ازاں اس لطفِ صحبت کو یاد کر کے لکھتے ہیں :- ”پریم چند بڑے خوش طبع، حاضر جواب اور زندہ دل تھے۔ وہ آپ کے ساتھ گھنٹوں ہنس سکتے تھے اور اپنی باتوں پر بھی ہنس پڑتے تھے..... ایک مرتبہ باتوں ہی باتوں میں دن کے دو بج گئے اور کھانا کھانے کی ذریت نہ آئی۔ یہ دیکھ کر پریم چند جی کہنے لگے کہ اتنا غنیمت ہے مسٹر پریم چند کے پاس گھڑی نہیں، نہیں تو اس تاخیر کے لئے جھاڑ بتائیں۔“

مرزا محمد عسکری لکھنوی نے جو بعد میں نول کشور پریس میں ان کے رفیق کا رہے پریم چند سے اپنی پہلی ملاقات کا تذکرہ اس طرح کیا ہے :-

”منشی پریم چند سے مجھ سے پہلی مرتبہ مولانا ظفر الملک ایڈیٹر ”المنظر“ کی ہمراہی میں ملاقات ہوئی۔ منشی صاحب کو دیکھ کر میرے اوپر ایک خاص اثر پڑا۔ میانہ قد، چھریا بدن، کتاب رو چہرہ، ناک نقشہ نہایت درست

آنکھیں بڑھی اور نمایاں ، سفید صاف باندھے ہوئے جوان پر بہت زیب دیتا تھا، یہ صافہ میں نے اکثر ان کو باندھے دیکھا ہے۔ مجھ پر منشی صاحب کی ذہانت اور قابلیت کا ایک نظر بڑا اثر ہوا۔ ہر چند کہ انھوں نے گفتگو میں کم حصہ لیا۔ مگر منشی اور مذاق کی باتوں میں ہمارے ساتھ شامل رہے اور اگر سچ سچ پوچھا جائے تو ہم دونوں سے زیادہ ہنسے۔ منشی صاحب کی یہ خصوصیت تھی (جس ان کی زندہ دلی اور نمک دلی کی خاص علامت تھی) کہ اکثر ہنستے تھے اور زور سے ہنسنے کے ساتھ ہنستے تھے اور بعد میں جب اکٹھے کام کرنے کا موقع ملا "میں نے ان کو دو تین برس کے دوران میں ہمیشہ شگفتہ اور ہنس مکھ پایا۔ کبھی غصہ اُن کے چہرے پر نہ دیکھا کبھی کبھی میں اُن سے مذاق کہتا تھا کہ کیوں صاحب کیا آپ کی غصہ کبھی نہیں آتا۔ کیا آپ کبھی گھر میں بھی غصہ نہیں کرتے۔ اس پر وہ ہنس دیتے تھے ۱۱

ان کے ایک دوسرے رفیق کار مرزا علی خضر لکھنوی نے لکھا ہے: "منشی صاحب بے خلق، ہنس مکھ اور منکسر آدمی تھے۔ میں نے انھیں ہمیشہ مسکراتے ہوئے پایا۔ چونکہ پبلشنگ ڈیپارٹمنٹ میں میرا قیام ۱۹۲۵ء تک رہا اس لئے وقتاً فوقتاً منشی صاحب سے نیاز حاصل کرنے کا شرف حاصل ہوتا رہا جب انھیں کوئی کام نہ رہتا تو پبلشنگ ڈیپارٹمنٹ میں چلے آتے اور اپنی گل ٹانگیوں سے ہمارے دماغ کو تازہ کر دیتے۔ قلم کی طرح اُن کی زبان میں بھی زور تھا، گفتگو بہت سلیس اور دلچسپ ہوتی کہ اس کے سننے کا دل سے اشتیاق رہتا ۱۲

یہ تو ہم عمر اور ادیب دوستوں کی بات تھی۔ لیکن وہ بچوں اور لڑکوں سے بھی اسی خندہ پیشانی سے پیش آتے اور کلاس پڑھانے وقت بھی اسی بے تکلفی

اور بے باکی سے ہنستے تھے۔ جب وہ گورکھ پور میں ماسٹر تھے اس وقت کے ان کے ایک شاگرد منشی منظور الحق حکیم لکھتے ہیں :-

”کلاس میں ان کے آتے ہی ایسی زندہ دلی پیدا ہو جاتی تھی کہ ہر ایک اُن کی طرف مخاطب ہو جانا۔ یہ ضروری نہ تھا کہ جو سبق پڑھانا ہے وہی پڑھایا جائے بلکہ جس موضوع کی طرف ان کا رجحان یا لڑکوں کا تقاضا ہوا بیان فرمانے لگے۔ اگر کلاس میں پڑھاتے وقت کوئی ہنسی کی بات آگئی تو بے اختیار ہنسے لگتے۔ کسی کا خوف دہرا اس نہیں تھا۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ انسپکٹر صاحب معائنے کے لئے آئے۔ بالوچن لال صاحب ہیڈ ماسٹر مرحوم جو بہت سیدھے آدمی تھے کچھ پریشان سے تھے۔ تمام لڑکے بھی اپنی اپنی ڈریس سے آراستہ تھے۔ مگر ہمارے استاد صاحب کا وہی عالم تھا جو پہلے لکھ چکا ہوں۔ نیگے سر بال پریشان، کوٹ کا کالر کھلا ہوا، انسپکٹر صاحب کلاس میں آئے مگر اس کا بھی کچھ اثر نہ ہوا۔“

یہ قہقہے ان کی شخصیت کا منظر تھے۔ پھول کی طرح ایک فطری مسکراہٹ اُن کے ہونٹوں پر کھلتی رہتی تھی جو کبھی جُلا نہیں ہوتی تھی۔ زندگی میں اتنی مصیبتیں اور مشکلیں برداشت کرنے کے بعد بھی اگر وہ ہنس سکتے تھے، قہقہے بلند کر سکتے تھے تو صاف ظاہر ہے کہ انھوں نے زندگی کی اہمیت کو سمجھ لیا تھا اُن کے نزدیک جینے کا حاصل رونا نہیں نہنا تھا۔ اس لئے وہ مصیبتوں کے باوجود خود ہنستے تھے اور دوسروں کو نہناتے تھے۔

ہیں اُن کے بہترین کردار بھی اسی اصول پر کاربند نظر آتے ہیں ”میلن“

کی موتی پر کیا کیا مصیبتیں نہیں پڑیں، گوروں نے اس کی عصمت دری کی، مقدمہ چلا، گھر بار چھوٹا۔ خاوند اور بچے سے الگ ہوئی، پھر بھی وہ سنہستی ہے، ہسکتی ہے اور ناول کے ہیرو امرکانت سے کہتی ہے۔ ”لا لہ تم مجھے رونا سکھانا چاہتے ہو لیکن میں تمہیں ناچنا سکھاؤں گی“

اس ناول میں امر اپنے باپ سے کہتا ہے ”دادا آپ کے گھر میں میری اتنی عمر برباد ہو گئی۔ اب میں اسے اور برباد کرنا نہیں چاہتا۔ آدمی کی زندگی کا نشانہ محض کھانا اور مر جانا نہیں ہے۔ نہ دولت، کمنا ہی اس کی زندگی کا مقصد ہے۔ میری حالت اب ناقابلِ برداشت ہو رہی ہے۔ میں اب ایک نئی زندگی کا آغاز کرنے جا رہا ہوں، جہاں مزدوری شرم کی چیز نہیں۔ جہاں عورت اپنے شوہر کو پستی اور زوال کی طرف نہیں لے جاتی بلکہ اس کی زندگی کو مسرت سے معمور کرتی ہے۔ میں رسوم اور خاندانی وقار کا غلام بن کر رہنا نہیں چاہتا مسرت ہی زندگی کی حقیقت ہے“

اس حقیقت کے احساس، نئی زندگی کے یقین اور مستقبل کے اعتماد سے یہ قبیلے پیدا ہوتے تھے۔ پریم چند حادثات سے کبھی پریشان نہیں ہوئے انھوں نے خندہ پیشانی اور زندہ دلی سے خارجی واقعات کا مقابلہ کیا اور زندگی کھلاڑی کی طرح لبر کی۔

منشی دیا نرائن نگم کو اُن کے ایک خورد سال بچے کی موت پر پریم چند نے تعزیت کا جو خط لکھا اس سے اُن کا زندگی کا سارا فلسفہ ادا ان قہقہوں کی نوعیت سمجھ میں آ جاتی ہے۔ لکھتے ہیں :-

”بھائی جان! سلیم! کل صبح ایک خط لکھا۔ شام کو آپ کا کارڈ ملا۔ پڑھ کر نہایت صدمہ ہوا۔ بیماریاں اور پریشانیاں تو زندگی کا خاصہ ہیں، لیکن بچے کی حسرت ناک موت ایک دل شکن حادثہ ہے، اور اسے برداشت کرنے کا اگر کوئی طریقہ ہے تو یہی کہ دنیا کو ایک تاشاگاہ یا کھیل کا میدان سمجھ لیا جائے۔ کھیل کے میدان میں دم ہی شخص تعریف کا مستحق ہوتا ہے جو جیت سے پھرتا نہیں، ہار سے روتا نہیں۔ جیتے تب بھی کھیلتا ہے اور ہارے تب بھی کھیلتا ہے۔ جیت کے بعد یہ کوشش ہوتی ہے کہ ہاریں نہیں۔ ہار کے بعد جیت کی آرزو ہوتی ہے ہم سب کچھ کھلاڑی ہیں مگر کھیل نہیں جانتے۔ ایک بازی جیتی، ایک گول جیتا۔ تو ہپ ہپ ہروں کے نعروں سے آسمان گونج اٹھا۔ ٹوپیاں آسمان میں اچھلنے لگیں۔ بھول گئے کہ یہ جیت دائمی فتح کی کارٹھی نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ دوسری بازی میں ہار ہو، علیٰ ہذا ہارے تو پست ہمتی پر کر باندھ لی، روئے، کسی کو دھکے دئے، فاقہ کھیلا اور ایسے پست ہو گئے گویا بھر جیت کی صورت دیکھنا نصیب نہ ہوگی، ایسے اچھے تنگ ظرف آدمی کو میدان میں کھڑے ہونے کا بھی مجاز نہیں۔ اس کے لئے گوشہ تار یک ہے اور فکر شکم۔ بس یہی اس کی زندگی کی کائنات ہے۔ ہم کیوں خیال کریں کہ ہم سے زندگی نے بیوفائی کی! خدا کا شکوہ کیوں کریں! کیوں اس خیالی سے ملوں ہوں کہ دنیا ہماری نعمتوں سے بھری تھالی کو ہمارے سامنے سے کھینچ لیتی ہے۔ کیوں اس فکر سے متوحش ہوں کہ فراق ہمارے اوپر چھاپہ مارنے کی تاک میں ہیں۔ زندگی کو اس نکتہ نگاہ سے دیکھنا اپنے اطمینانِ قلب سے ہاتھ دھونا ہے۔ بات دونوں طرح ایک ہی ہے۔

تذاق نے چھاپہ مارا تو کیا؟ ہار میں سارے گھر کی دولت کھو بیٹھے تو کیا؟ فرق صرف یہ ہے کہ ایک جبر ہے اور دوسرا اختیار۔ تذاق زبردستی مال پر ہاتھ بڑھاتا ہے۔ لیکن ہار زبردستی نہیں آتی۔ کھیل میں شریک ہو کر ہم خود ہار اور جیت کو بھلا تے ہیں۔ تذاق کے ہاتھوں لوٹا جانا زندگی کا معمولی واقعہ نہیں حادثہ ہے لیکن کھیل میں ہارنا اور جیتنا معمولی واقعے ہیں۔ جو کھیل میں شریک ہو گا وہ بخوبی جانتا ہے کہ ہار اور جیت دونوں ہی سامنے آئیں گی۔ اس لئے اسے ہار سے مایوسی نہیں ہوتی جیت سے پھولا نہیں سمانا۔ ہار کا کام تو صرف کھیلنا ہے۔ خوب دل لگا کر کھیلنا، خوب جی توڑ کر کھیلنا، اپنے کو ہار سے اس طرح بچانا گویا ہم کونین کی دولت کھوٹیں گے۔ لیکن ہار نے کے بعد پٹھنی کھانے کے بعد گرد جھاڑ کر کھڑے ہو جانا چاہئے۔ اور پھر غم ٹھونک کر حریف سے کہنا چاہئے کہ ایک ہار اور!

کھلاڑی بن کر آپ کو واقعی بڑا اطمینان ہو گا۔ میں خود نہیں کہہ سکتا کہ میں اس معیار پر پورا اُتروں گا یا نہیں۔ مگر کم سے کم اب سچے کسی نقصان پر اتنا رنج نہ ہو گا جتنا آج سے چند سال قبل ہو سکتا تھا۔ میں اب شاید نہ کہوں گا۔ کہ ہائے زندگی کا رت گئی، کچھ نہ کیا۔ زندگی کھینے کے لئے ملی تھی۔ کھینے میں کوئی نہیں کی آپ مجھ سے زیادہ کھیلے ہیں۔ ہار اور جیت دونوں دیکھی ہیں۔ آپ جیسے کھلاڑی کے لئے مشکوہ تقدیر کی ضرورت نہیں۔ کوئی ٹولف اور پورہ کھیلنا ہے، کوئی کبتی کھیلنا ہے بات ایک ہی ہے۔ ہار اور جیت دونوں ہی میدانوں میں ہیں۔ کبتی کھینے والے کو جیت کی خوشی کچھ کم نہیں ہوتی، اس ہار کا غم نہ کیجئے۔ آپ نے خود ہی نہ کیا ہو گا۔ آپ مجھ سے مشاق ہیں۔ میں ۵ یا ۶ مئی تک کا پورا اُٹنے والا ہوں

یہاں کی کوئی چیز درکار ہو تو بے تکلف لکھئے گا۔ دیگر حالات میرے پہلے خط سے معلوم ہوئے ہوں گے۔

کھلاڑی پن کا فلسفہ کلیتہً ٹھیک نہیں ہے تاہم اگر یہ فلسفہ پریم چند کے اعتماد کی بنیاد نہ بن جاتا تو جن مصیبتوں میں سے انھیں گزرنا پڑا تھا وہ یقیناً لاکھوں کردروں، بے بس اور مصیبت زدہ ہم وطنوں کی طرح انفرادیت پسند بن جاتے، اور خارجی واقعات کے خلاف جارحیت کرنے کی بجائے اپنے اندر ہی مصائب کا حل دھونڈتے، سورگ نرک اور مکتی کی تمنائیں زندگی بے مصرف کھود دیتے۔ اس کے برعکس پریم چند نے سمجھ لیا تھا:-

"یہ مکتی اور بھکتی تو انتہائی غریبی ہے جو ہماری انسانیت کو تباہ کئے ڈالتی ہے....." (گنودان)

اور ایک دوسری جگہ "لوک جھونک" میں لکھتے ہیں:-

"سورگ اور نرک کے خیال میں وہ رہتے ہیں، جو کاہل ہیں، مردہ ہیں ہماری دوزخ اور بہشت سب اس زمین پر ہے۔ ہم اس دایرِ عمل میں کچھ کرنا چاہتے ہیں۔"

یہ فلسفہ پریم چند کے ادب کی بنیاد ہے۔ ان کے کردار باعمل انسان ہیں اگرچہ وہ نچلے چھوٹے طبقے کے مفلس اور مصیبت زدہ انسان ہیں۔ اس لوٹ کھسوٹ اور خون چوسنے والے نظام میں ان کی معمولی معمولی تمنائیں بھی پوری نہیں ہوتیں۔ پھر بھی جینا اپنا حق سمجھتے ہیں اور ہمت سے جے جاتے ہیں چونکہ انھیں زندگی اور عمل میں اُل دسوا س ہے اس لئے یہیں ان کے تپتے

بھی کہیں بلند، کہیں خاموش سناؤ دیتے ہیں، کہیں طنز اور کہیں حقارت کا اظہار کرتے ہیں، اور کہیں وہ ریاکاری اور پاکھنڈ پر حملہ کر کے بے ساختہ ہنس پڑتے ہیں۔ ان کی ایک کہانی بڑے بھائی صاحب ہے، جس میں بڑا بھائی ہر وقت پڑھتے رہنے کے باوجود ہر سال فعل ہوتا ہے۔ لیکن چھوٹا بھائی اکثر کھیلتے رہنے کے باوجود ہر سال اچھے نمبروں سے پاس ہوتا ہے۔ پھر بھی بڑا بھائی چھوٹے کو اس لئے نصیحت کرتا اور اس پر رعب گناٹھتا ہے کہ وہ بڑا بھائی ہی یہ کہانی چھوٹے بھائی کی زبانی بیان کی گئی ہے اور شروع یوں ہوتی ہے :-

”میرے بھائی صاحب مجھ سے پانچ سال بڑے تھے۔ لیکن صرف تین درجے آگے۔ انھوں نے بھی اسی عمر میں پڑھنا شروع کیا تھا جب میں نے شروع کیا، لیکن تعلیم جیسے اہم معاملے میں وہ جلد بازی سے کام لینا پسند نہ کرتے تھے اس عمارت کی بنیاد خوب مضبوط ڈالنا چاہتے تھے۔ ایک سال کا کام دو سال میں کرتے تھے تاکہ عمارت پختہ ہو جائے۔“

ساری کہانی پڑھ جانے کا شوق دل میں چٹکیاں لینے لگتا ہی کہانی مایہ ناز فرج میں ایک مہاشے کا سراپا بیان کرتے ہیں :-

”جہاں چکر دھر سر گھٹاتے تھے۔ مگر لمبی چوٹی رکھ چھوڑی تھی جو چٹس میدان کے کسی جھنکار درخت کی طرح نمایاں تھی۔ ان کا دعوئے تھا کہ چوٹی کے راستے جسم کی غیر ضروری اور مضر حرارت خارج ہوتی رہتی ہے، اور مقناطیسی اثر جسم کے اندر نفوذ کرتے ہیں۔“

مہاشہ اس شخص کو کہتے ہیں جو خارجی دنیا سے ناتہ توڑ کر داخلیت پسند

ہو جائے۔ دمانے کی بدلتی ہوئی فدروں کو سمجھنے اور اس کے ساتھ چلنے سے انکار کر کے پھر ایسے لوگ جاہل مطلق اور کم ظرف ہوتے ہوئے بھی بڑے فلاسفر اور دھرماتا ہونے کی ٹینگ مارتے ہیں۔ پریم چند ایسے لوگوں کی جیسا کہ اس کہانی کے نام "ایہ تفریح" سے ظاہر ہے خوب خبر لیتے تھے انہیں جھوٹے تقدس اور دقیا نوی پن سے بے چارہ چڑھ تھی۔ وہ اس پر چوڑ کرنے سے کبھی نہیں چوکتے تھے۔ اپنی معصوم بچہ کہانی میں انہوں نے ایک ایسا کردار پیش کیا ہے جو بالکل ان پڑھ ہے اور دوسروں کا کھانا بنا کر گذر بسر کرتا ہے۔ لیکن اسے اپنے برہمن ہونے پر فخر ہے اس کی بات لکھتے ہیں :-

”وہ برہمن ہے اور چاہتا ہے کہ دنیا اس کی تعظیم کرے اور خدمت کرے اور کیوں نہ چاہے؟ جب اجداد کی پیداکا ہدیٰ ملکیتوں پر آج بھی لوگ قابض ہیں اور اس شان سے قابض ہیں گویا انہوں نے خود پیداکا ہوں تو وہ کیوں اس تقدس اور امتیاز کو ترک کر دے جو اس کے بزرگوں نے پیدا کیا تھا یہی اس کا ترکہ ہے“

اس کہانی کے کردار گنگو کا یہ جھوٹا افتخار پھر بھی قابلِ عفو ہے، کیوں کہ وہ اُن پڑھ اور جاہل ہوتے ہوئے شریف اور بھلا مانس ہے اور محنت مزدوری کر کے روزی کما تا ہے۔ لیکن ایسے برہمنوں کی ایک پوری فوج ہے جنہوں نے اس آبائی تقدس اور امتیاز کو دوکان داری بنا رکھا ہے اور جن کی دوکان پر پاکھنڈ اور ریاکاری، کینگی اور کم ظرفی کی جنس کے سوا کچھ بھی نہیں بنارس ہندو دھرم کی اس نحوست کا مرکز ہے۔ پریم چند کے ہاں موٹے رام شاستری

اس ساری نحوست اور کم ظرفی کا مجسمہ ہے جسے انھوں نے ساری زندگی خوب رگیدا ہے۔ ”دعوت“ کہانی کا لطف اور مزاح کون بھول سکتا ہے جس میں اس پیٹو اور ڈکارو برہمن کی ہوس اور کمینگی پر پھنپیاں کسی گئی ہیں۔ ”ستہ گرہ“ میں بھی اسکا حریص اور پیٹو برہمن موٹے رام کو حکام نے کرایے پر لیا ہے۔ اور یہاں بھی وہی ظرافت اور مزاح ہے۔

”پریم آشرم“ (گوشہ عافیت) میں ایک مذہبی جلسہ کا ذکر کرتے ہوئے دھرم اور تہذیب کے ٹھیکے داروں کا تلک دھاری پنڈتوں اور سنیا سیوں کا اصلی روپ پیش کیا ہے۔ ان لوگوں کی رحبت پسندی کا خوب نمونہ اڑایا ہے، لکھتے ہیں:-

”ایک سنیا سی صاحب نے فوراً اپنا لکچر شروع کر دیا یہ حضرت ویدانت کے ماہر اور جوگ کے کامل تھے۔ سنسکرت کے عالم تھے۔ وہ ہمیشہ سنسکرت ہی بولتے تھے اُن کی نسبت مشہور تھا کہ سنسکرت ہی ان کی مادری زبان ہے، ان کی تقریر کو لوگ اس شوق سے سنتے تھے جیسے چندول کا گانا سنتے ہیں کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ مگر اُن کی قابلیت اور روانی، بیان کا رعبتوں پر چھا جاتا تھا۔“

”بازارِ حسن“ میں سمن بائی نے جب اپنے پیشے کو ترک کرنے کی ٹھان لی تو سٹھل واس سے کہا کہ میں ذرا چلتے چلائے اپنے عاشقوں کی فراج پر سی تو کروں۔

اب سہانے رسیا میاں ابوالوفا اور بھینسا قد لالہ جن لال اور بھگت

پنڈت دینا ناتھ ایک ایک کر کے آتے ہیں ، اور وہاں ان کی جوگت بنتی ہے ، وہ ناول میں ڈرامائی کیفیت پیدا کر دیتی ہے ۔ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑھاتے ہیں ۔

تمبھے نشتر ہیں جو سماج کی رگوں سے گندہ مواد نکالنے کے لئے فسد لگانے کا کام دیتے ہیں ۔ یہ تمبھے کہیں بھی بے مصرف نہیں ہیں ۔ جوں جوں پریم چند کا شعور اور فن نچتے ہوتا گیا یہ نشتر زیادہ تیز اور زیادہ کارگر ہونے لگے ۔ اُن کے استعمال کا ڈھنگ بھی بدل گیا ۔

انھوں نے مذہبی ، سماجی ، اخلاقی اور سیاسی ہر موضوع اور ہر پہلو پر لکھا ہے ۔ لیکن وہ کہیں بھی زاہدِ خشک نہیں بنے ۔ موضوع جتنا دقیق اور پیچیدہ ہوتا ہے طرزِ تحریر اتنا ہی شگفتہ ہو جاتا ہے ۔ آدمی یہ فیصلہ ہی نہیں کر پاتا کہ وہ جو کچھ پڑھ رہا ہے اُس پر ہنسے یا روئے ۔ بڑی دیر تک گو گوگو کی کیفیت طاری رہتی ہے اور جتنا آدمی سوچتا ہے اتنا ہی افرزِ زیادہ ہوتا ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ بہت بڑی بات نہایت مختصر الفاظ میں کہہ جاتے ہیں مثلاً یہ بہت بڑی بات تھی کہ گاندھی نے چور اچوری کے واقعہ کی اڑلے کر عدم تعاون کی تحریک کو یکایک بند کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اتنا بڑا قومی اتحاد ریزہ ریزہ ہو گیا ۔ اور آزادی کی جدوجہد نے شدھی اور تبلیغ کا روپ دھارن کر لیا ممکن نہیں کہ یہ حالت دیکھ کر پریم چند کا حساس دل آئینہ ردوے ۔ لیکن ان کا مدونے کا ڈھنگ مختلف تھا ۔ بڑے بابو ” کہانی پڑھئے تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے کس طرح اپنے درد کو طرافت میں سمو دیا ہے ۔ دراصل یہ ان کا اپنا

درد نہیں۔ مظلوم اور فریب خوردہ انسانیت کا درد ہے۔

چند صفحات کا ناول ”گنودان“ کیا ہے۔ اسی انسانیت کے درد کی تصویر ہے۔ گاندھی کا نمک ستیاگرہ جس کی پریم چند نے شد و مد سے تائید کی تھی۔ گاندھی اردن پکیٹ میں ختم ہو گیا۔ گاندھی اچھوت اور دھار میں جلنے لگے اور گمان بے چارے کو جو اس تحریک کی جان تھا بے بس چھوڑ دیا گیا۔ اب اس کا دکھڑا کون روئے؟ پریم چند، لیکن پریم چند کا شعار رونا نہیں تھا۔ رونابے علی کی دلیل ہے، اور ان کے کردار ہوری، گو بر دھنیا اور جھنیا بھی روتے ہیں۔ مصیبتوں کے باوجود ہنستے ہیں۔ زندگی کی جدوجہد جاری رکھتے ہیں اور اپنے چھوٹے چھوٹے افعال کے ذریعے ان جانے ہی منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

جدوجہد ان کرداروں کی زندگی کا جزو ہے۔ اسی طرح قہقہے بھی ان کی زندگی کا جزو بن کر سامنے آتے ہیں مثلاً جھنیا گو بر کو اپنی زندگی کے واقعات سن رہی ہے کہ وہ دودھ لے کر جاتی تھی تو لوگ کس طرح حریص نگاہوں سے اس کی ریس بھری جوانی کی طرف دیکھتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک تلک دھاری پنڈت تو اس قدر بڑھے کہ جھنیا کو زبردستی پکڑنا چاہا، لیکن چالاک جھنیا نے دودھ کی مثلی پنڈت کے سر پر ٹپک دی۔ یہاں پریم چند لکھتے ہیں

”گو بر قہقہہ لگا کر بولا ”بہت اچھا کیا تم نے، دودھ سے نہا گیا ہو گا۔“
تلک چھا پھی چل گیا ہو گا۔ مونچھیں بھی کیوں نہ اکھاڑیں۔“

قہقہے تحریک کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ پڑھنے والے کے دل میں تحریک

پیدا ہوتی ہے کہ سماج کے رنگے سیاروں کی سچ مچ سرخیں اکھاڑ لی جائیں۔
اس ناول کا ایک اور واقعہ۔ جب مس مالتی جینے ہوئے پارسا دنگار
داس کو شراب پینے کی ترغیب دینے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو رائے صاحب کی
محفل میں جان سی پڑ جاتی ہے۔

”ہال میں ایسا شور مچا کہ کچھ نہ پوچھو جیسے پٹاری میں سے بلند قہقہے نکل
پڑے ہوں۔ واہ دیوی جی کیا کہنا۔ کہاں سے مالتی کہاں ہے۔ توڑ دیا نلک کا
قانون، توڑ دیا دھرم کا قلعہ، توڑ دیا پارسائی کا گرہ!“
اب ایڈیٹر دنگار داس کھسیانے ہو کر دلیل بازی کرنے لگے توجہ پت
پڑی، ”قانون بھی تو بندھن ہے اسے کیوں نہیں توڑتے؟ بس وہی بندھن
توڑو جو اپنی ہڈیوں کی راہ میں رکاوٹ ڈالتے ہوں۔ اس کو سائپ
بن کر پیڈ اور تیس مار خاں بنو۔“

پریم چند کی محفلوں میں۔ پڑھے، ان پڑھے، بڑے، چھوٹے مرد اور
عورتیں سب ہنستے ہیں، جو ہنس نہیں سکتے ان سے پریم چند کو کوئی ہمدردی
نہیں۔ اب ذرا خالص عورتوں کی محفل دیکھئے ”قرب“ کہانی کی جگنو
بائی پوری شیطان کی خالہ ہے۔ دوسروں کے چھوٹے چھوٹے نقص اور
برائیاں جمع کرنا اور انھیں ادھر ادھر پھیلا نا اس کا کام ہے جس کی وجہ سے
چھلا آشرم کی چھوٹی بڑی استانیاں بھی اس سے ڈرتی ہیں۔ لیکن نئی
ہیڈ مٹرس مس غور شید نے اس کی ساری شجھی کر کر دی۔ اسے بنائے
کے لئے ولیم گنگ سے معاشقہ کا ڈرامہ کھیلا۔ اب جگنو کو یہ بات کہاں

پہنچتی، رات بھر بڑی مشکل سے کالی صبح ہوتے ہی سارے اُشرم میں یہ خبر پھیلادی اور مس خورشید کے خلاف طومار باندھا، لیکن جب آخر میں معلوم ہوا کہ رات کو مس خورشید کے پاس شراب کے نشے میں دھت جو دیم کنگ آیا تھا اور جس سے ڈر کر جگنو بائی بھیگی بلی کی طرح دبک گئی تھی۔ وہ ورہل اُشرم کی ڈاکٹر لیلا دتی ہیں، اور مس خورشید اور لیلا دتی نے صرف جگنو کو بنانے اور ذلیل کرنے کے لئے یہ کھیل کھیلا ہے تو.....

..... چاروں طرف ہنسنے بلند ہوئے۔ کوئی تالیاں بجاتی تھی کوئی ڈاکٹر لیلا دتی کی گردن میں لپٹی جاتی تھی۔ کوئی مس خورشید کی پیٹھ پر ہتھکیاں دیتی تھی۔ کئی منٹ تک ہوجن مچا رہا۔ جگنو کا سُنہ اس روشنی میں بالکل ذرا سا نکل آیا۔ زبان بند ہو گئی۔ ایسا چرکا اس نے کبھی نہ کھایا تھا۔ اتنی ذلیل کبھی نہ ہوئی تھی

.....

اس دن سے پھر کسی نے جگنو کی صورت نہیں دیکھی۔ اُشرم کی تاریخ میں یہ معاملہ آج بھی مایہ نفع طرح بنا ہوا ہے۔

سوزِ وطن

وہ تلوار جو کیلے کو بھی نہیں کاٹ سکتی
 دھار پر چڑھ کر لوہے کو بھی کاٹ سکتی ہو
 انسانی زندگی میں دھن بڑے کام کی چیز
 ہو جس میں لاگ ہو وہ بوڑھا بھی جوان ہو
 جس میں لاگ نہیں، عزت نہیں، وہ
 جوان بھی ہو تو مردہ ہے۔

اپریم چند
 کانپور سے پریم چند مسئلہ مریم ہو یا ضلع بہار پور میں ڈسٹرکٹ بورڈ کے
 سب انسپکٹر ہو کر چلے گئے، اور ہویا میں چھ سال تک مسلسل رہے اور
 یہیں انھوں نے اپنے مشہور تاریخی افسانے ”آلھا“، ”رانی سارندھا“ اور

”وکرمات کا تیغہ“ وغیرہ لکھے۔ ان میں بندے راجپوتوں کی بہادری اور
جوان مردی کے قصے بیان کئے گئے ہیں اور ان کا مختصر ناول ”سوشی رانی“
بھی انہی بندے راجپوتوں کی شجاعت سے متعلق ہے۔ ان کہانیوں کے کرداروں
کے لئے ان پر مٹ جانا معمولی بات ہے، لیکن راجپوتوں کی تعریف سے پریم چند
کا مقصد احیا پرستی ہرگز نہیں تھی۔ ان کہانیوں کے ذریعے وہ ہندوستانی
عوام کی خودداری اور علم و ہمت کو بیدار کرتے ہیں ان کی سوشی ہوئی غیرت کو جگا
ہیں اور بے حسی کو متحرک کرتے ہیں۔

مختلفہ ذمہ میں عالم گیر اقتصادي سنکٹ نمودار ہوا سرمایہ دارانہ
نظام کا یہ سب سے پہلا خوفناک سنکٹ تھا۔ نوآبادیات کی تقسیم مکمل ہو
تھی، جرمنی وغیرہ ممالک کی نئی سرمایہ داری کو پھیلنے کے لئے کوئی جگہ نہیں
تھی۔ سرمایہ داری کا اندرونی تضاد پوری شدت سے ابھرا ہوا تھا جو آگے
چل کر مختلفہ ممالک کی عالم گیر جنگ پر منتج ہوا۔

اس سنکٹ کے ساتھ ہی مختلفہ ذمہ میں عالم گیر بے کاری پھیل گئی
جس کی وجہ سے ایشیائی ممالک میں مغربی سامراجیوں کے خلاف آزادی
کی جدوجہد منظم اور تیز ہونے لگی۔ ہندوستان میں آزادی کی اس جدوجہد
نے تقسیم ہنگامہ کے خلاف تحریک کا روپ دھارن کیا اور کانگریس جس
کا کام اب تک ریزولیشن پاس کرنا اور انگریزوں سے مراعات مانگنا
تھا سو راج کی باتیں کرنے لگی، اور اس میں گرم دل کی بنیاد پڑ گئی۔ انگریز
حکمرانوں نے تعلیمی اداروں پر قبضہ کر کے ہندوستان کی تاریخ کو بالکل مسخ

کر دیا تھا، وہ نوخیز دماغوں میں سب سے سہمی کا یہ جذبہ بھردینا چاہتے تھے کہ ہندوستانی قوم ہمیشہ سے بھڑکی ہوئی ہے اور وہ صرف محکوم رہنے کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ اس غلط فلسفہ کا تدارک کرنے کے لئے رانا ڈے، تلک اور لاجپت رائے وغیرہ کانگریسی لیڈروں اور دانشوروں نے تاریخ کو از سر نو لکھا کیونکہ تاریخ وہ اسلحہ خانہ ہے جہاں سے محکوم قوموں کو اپنے غیر ملکی حاکموں کے خلاف لڑنے کے لئے عمل کی تحریک ملتی ہے۔ پریم چند بھی شاید اسی لئے تاریخی کہانیاں لکھنے کی طرف مائل ہوئے تھے۔ لیکن ان کے ذہن کی ساخت کانگریسی لیڈروں سے مختلف تھی۔ وہ عوام میں سے پیدا ہوئے تھے اور عوام کے لئے تحریک کو اُگے بڑھانا چاہتے تھے۔ اس لئے تاریخ کے متعلق ان کا نظریہ لیڈروں سے بہت حد تک مختلف ہے۔ اور انھوں نے اپنی تاریخی کہانیوں میں عوام کو مخاطب کیا ہے۔

اگر کوئی ادیب اپنے وقت سے آگے نہ جاسکے تو کم از کم وقت کا ساتھ دینا تو اس کا فرض ہوتا ہے چنانچہ پریم چند نے اپنی اس دور کی کہانیوں میں حب الوطنی کے جذبے کو ابھارا ہے۔ "دنیا کا سب سے انمول رتن" میں ہے وہ اپنی پہلی کہانی کہتے ہیں، "اور جو شہنشاہ میں شائع ہوئی تھی۔ خوں کے اس قطرے کو انمول رتن کہا ہے جو وطن کی محبت میں بہایا جاتا ہے۔ ان کے ناول جلوہ ابتکار کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ ایک ماں دیوی کی لگتا تو پوجا کرتی ہے۔ جب دیوی خوش ہو جاتی ہے تو ماں بردوان مانگتی ہے کہ مجھے ایسا بیٹا دے۔ دیوی نے پوچھا جو بہت دھنواں ہو، بلوان ہو یا دنیا بھر

میں شہرت حاصل کرے۔ لیکن ماں نے کہا ”نہیں مجھے ایسا بننا چاہیے جو وطن کی خدمت کرے۔“

یہ ناول اپنی دنوں لکھا گیا تھا اور ۱۹۱۲ء میں شائع ہوا تھا لیکن اس ناول سے پہلے ۱۹۰۹ء میں ان کی ایک کتاب ”سوزِ وطن“ شائع ہوئی جو ان کی زندگی میں سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ کیونکہ غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف ان کی اس لڑائی کا آغاز اس کتاب سے ہوا جسے وہ پھر ساری عمر تندی سے لڑتے رہے۔ ایک اپنچ بھی پیچھے نہیں ہٹے۔ ان کا قدم ہمیشہ آگے ہی بڑھتا رہا۔ آخر یہ لڑائی ہر قسم کے سیاسی، طبقاتی اور سماجی ظلم اور رجعت پسندی کے خلاف لڑائی بن گئی، اور یہ لڑائی ان کی ادبی تخلیقات کو جلا دیتی رہی۔

”سوزِ وطن“ پریم چند کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ تھا جو پانچ کہانیوں پر مشتمل تھا۔ اس میں ”دنیا کا سب سے انمول رتن“ کے علاوہ چار کہانیاں اور شامل تھیں۔ یہ مجموعہ زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا تھا اور قیمت پانچ آنے تھی۔ ان سب کہانیوں میں کسی نہ کسی ڈھنگ سے حب الوطنی کے جذبے کو ابھارا گیا تھا۔ اب انگریز حکمران یہ کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ کوئی ادیب ہندوستان میں بھی حب الوطنی کے جذبے کو بھڑکائے۔ انھوں نے نہ صرف کتاب ضبط کی بلکہ جتنی کتابیں ان کے ہاتھ لگیں تھیں اسی وقت آگ میں جلا دیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی ادیب کی کتابوں کو اس کی نظروں کے سامنے یوں نذرِ آتش کیا گیا۔ شاید وہ سمجھتے تھے کہ اس سے اس کا حب الوطنی کا جذبہ بھی جل جائے گا۔ لیکن یہ امن کی بھول تھی۔ اس

جبر سے یہ شعلہ اور بھی بھڑک اٹھا۔

”سوز وطن“ کی کہانیاں فن کے اعتبار سے کچھ زیادہ اچھی نہیں تھیں۔
 فراق گورکھ پوری رقمطراز ہیں کہ تیس برس ہوئے، ان کے پانچ افسانے ”سوز وطن“
 کے نام سے زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوئے۔ پریم چند اور ان کے متبعین
 اردو ہندی زبان میں افسانہ نویسی کو اس بلند مقام پر پہنچا دیا ہے جہاں آج ہم
 اسے دیکھتے ہیں۔ عصر حاضر کی بہترین تصانیف کی جگہ کی روشنی اس
 کتاب کی ہلکی اور دھیمی روشنی کو سایے میں ڈال دے گی۔ مگر تاریخ افسانہ نگاری
 میں وہ ایک رفیع نشان ہے۔ وطن پرستی کا شریف جذبہ ان صفحات میں
 سانس لے رہا ہے۔ ان کہانیوں میں کوئی بات قابل اعتراض نہیں ہے،
 وہ نہایت اطمینان سے لڑکے اور لڑکیوں کی درسی کتابوں میں داخل کی جاسکتی ہیں
 لیکن تیس برس پہلے کی دنیا اور تھی! باخبر اور خائف عمال حکومت نے مصنف
 سے باز پرس کی۔ میری ان کی ملاقات کو زیادہ دن نہ گزرے تھے جب انھوں
 نے اپنے بے تکلف اور صاف طرز میں مجھ سے بیان کیا کہ انسپکٹر ملا رس
 نے انھیں کس طرح اپنی تصنیف کی پانچ سو جلدوں میں آگ لگا دینے پر مجبور کیا۔
 پریم چند کے دل پر اس واقعہ کا گہرا اثر پڑا تھا، کوئی بھی دوست اور
 رفیق ایسا نہ ہوگا جس سے انھوں نے اس واقعے کا ذکر نہ کیا ہو اور واقعہ کو
 بیان کرتے وقت ان کے دل کا درد اور سوز اُبل پڑتا تھا۔ گویا ایک زخم
 تھا جبر ہر وقت رستا رہتا تھا اور اندام کی صورت ڈھونڈ رہا تھا۔
 منشی پیارے لال شاکر میرٹھی لکھتے ہیں:-

۱۹۱۰ء یا سلاسلہء عکا ذکر ہے۔ منشی صاحب اس زمانے میں ڈوہڑی اسپیکر مدارس تھے۔ اور ہمیر پور میں قیام تھا کسی خاص ضرورت سے مجھے کانپور جانا پڑا اتفاق سے بازار میں منشی پریم چند سے ملاقات ہو گئی۔ ایک گھنٹے تک ساتھ رہا۔ اسی ایک گھنٹے میں دنیا بھر کی باتیں ہو گئیں۔ میں نے سوز وطن کے بارے میں کیفیت دریافت کی تو کہا ”کیا کہوں، بڑی مصیبت میں پھنس گیا تھا وہ۔“ خبریت ہوئی کہ کتابیں دے کر سچھا چھوٹ گیا۔ ورنہ جان پر اپنی تھی۔ اس کے بعد جان بچی لاکھوں پائے۔ “ کہہ کر بڑے زور کا قہقہہ لگایا۔ اس کے بعد فرمایا ”منشی دیان رائے نغم کے مطبع سے پہلی کتاب ”سوز وطن“ شائع ہوئی تھی معلوم نہیں کیا وجہ ہوئی کہ کتاب پر پیشہ اور پرنٹر کا نام نہیں چھپا ظاہر ہے کہ ایسی غلطی عمداً نہیں ہو کر تھی مگر سننا کون ہے۔ جانچ پڑتال ہوئی تو اس سلسلے میں میرا نام بھی کھل گیا۔ خود ہی سوچو، کہ ایک سرکاری ملازم اور اور ”سوز وطن“ ایسی مسموم کتاب کا مصنف! تو بہ، تو بہ۔ وہ تو اچھا ہوا کہ کتابوں پر بلا ٹل گئی ورنہ کیا عجب تھا کہ مانند لے کی ہوا کھانی پرتی۔“ اتنا کہہ کر پھر ایسے زور کا قہقہہ لگایا کہ بازار دواے بھی ہٹکا بٹکا رہ گئے۔“

شاہر صاحب مزید لکھتے ہیں :-

”سوز وطن“ مختصر سی کتاب تھی جس میں پانچ چھ مختصر افسانے تھے اور قیمت بھی چار پانچ آنے سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن یہی وہ کتاب ہے جس نے انھیں پریم چند بنا دیا۔ یہ افسانے جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے۔ ملکی و قومی جذبات کے ترجمان تھے اور عام طور پر ان کو بہت پسند

کیا گیا تھا۔ منشی صاحب کا تعلق محکمہ تعلیم سے تھا۔ "سوز وطن" پر نہ صرف اعتراض ہوا بلکہ ملازمت تک کے لائے ہوئے گئے۔ خدا خدا کے وہ بلا لگئی اور اسی کی ساتھ منشی جی کی بھی کاہلیٹ ہو گئی۔

اب تک وہ "نواب رائے" کے نام سے لکھتے تھے۔ اس واقعے کے بعد انھوں نے پریم چند کے نام سے لکھنا شروع کیا۔ لیکن نام تبدیل کرتے ہوئے انھیں بہت قلق ہوا۔ منشی دیا نرائن گم کو بھی "سوز وطن" پر پریٹ لائن نہ چھاپنے کی بھول کرنے کی پاداش میں پچاس روپے جرمانہ ادا کرنا پڑا تھا۔ چنانچہ اس معاملے سے ان کا بھی براہِ راست تعلق تھا اور پریم چند نام انھیں نے تجویز کیا تھا، لکھتے ہیں :-

پریم چند شروع میں "نواب رائے" کے نام سے لکھا کرتے تھے اور یہ نام انھیں بہت عزیز تھا، کیونکہ ان کے والد پیارے "نواب" کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ اور یہ نام ہندو مسلمان کے معاشرتی اتحاد کی یاد بھی تازہ رکھنے والا تھا۔ مگر جب سوز وطن کی بے صابطہ ضبطی کے بعد ان کے افسران نے انھیں تصنیف و تالیف کی ممانعت کر دی تو ان کو اس نام کو خیر باد کہنا پڑا۔ ان تنگ خیال افسروں کا بس چہا تو اچھی نہ ہوئی ادب میں پریم چند کا وجود ہی نہ ہوتا۔ مگر دریا کا بہاؤ کس نے روکا ہے ہوا کا مسخ کون بدل سکا ہے؟ "نواب رائے" کی روح نے پریم چند کے قالب میں جنم لیا۔ یہ نام راقم الحروف ہی نے تجویز کیا تھا اور عرصے تک وہ اس نام سے صرف "زمانہ" ہی میں لکھتے رہے۔ یہ پابندی خود ان کی

ثبت نے اُن پر عائد کی تھی ورنہ اس کا کوئی مطالبہ یا معاہدہ نہ تھا ۛ

پریم چند اس کے قائل نہ تھے کہ گورنمنٹ ہر قسم کی زیادتی کرے اور وہ اس کے ساتھ انتہائی ایماندار ہی برتتے رہیں۔ چنانچہ سوز وطن کی جس قدر کاپیاں ان کے پاس تھیں وہ اُنھوں نے حکام کے حوالے کر دیں۔ مگر میرے پاس جو شاک باقی رہ گیا تھا اس کی کسی نے خبر نہ لی اور یہ کتابیں ضائع ہونے سے بچ گئیں اور آہستہ آہستہ فروخت ہوتی رہیں۔ پریم چند تصنیف و تالیف مضمون نگاری کے متعلق اپنے افسر دل کا حکم جانتے تھے۔ اس لئے اس کی اعلانیہ خلاف ورزی نہ کر سکے پر بھی وہ "پریم چند" کا نام اختیار کر کے پہلے سے بھی زیادہ سرگرمی سے لکھنے لگے۔ پریم چند کے نام کے متعلق یہاں پر ان کے ایک خط کا اقتباس بے جا نہ ہوگا جو انھیں دنوں اٹھوٹے راقم الحروف کو لکھا تھا:-

"برادر دم! ایک کارڈ لکھ چکا ہوں۔ اب مفصل خط لکھ رہا ہوں۔ میں نے "بحر مادت کا تیغ" ایک قصہ لکھنا شروع کیا ہے۔ بارہ تیرہ صفحے ہوئے ہیں۔ شاید پانچ چھ طے اور چلے۔ جلد ہی ختم کر کے بھجوں گا۔

"پریم چند" اچھا نام ہے، مجھے بھی پسند ہے۔ افسوس صرف یہ ہے کہ پانچ چھ سال میں "نواب رائے" کو فروغ دینے کی جو محنت کی گئی وہ سب اکارت ہو گئی، یہ حضرت قسمت کے ہمیشہ لندہ دے رہے۔ اور شاید نہیں گے۔

ہی پر کیوں نہ ہو۔ مجھے پہلے جناب فیض آب کلکٹر صاحب بہادر کی خدمت میں پیش کرنا ہوا گا اور مجھے چھٹے چھ ماہ لکھنا نہیں۔ یہ تو میرا روزگار کا دھندا ٹھہرا۔ ہر ماہ ایک مضمون صاحب بہادر کی خدمت میں پہنچے تو وہ یہ سمجھیں گے کہ میں اپنے فرائض سرکاری میں خیانت کرتا ہوں۔ اور کام سر پر تھک چکا ہوں گا۔ اس لئے نواب رائے مرحوم ہیٹھے، اُن کے جانشین کوئی اور صاحب ہوں گے۔“

پریم چند نے ایک مضمون میں اپنے جو مختصر حالات قلم بند کئے ہیں اس میں ”سوز وطن“ کی ضابطی کا ذکر خاص تفصیل سے کیا ہے۔ کیونکہ کالج میں پڑھنے کا ارمان میں رہ جانے کے واقعہ کی طرح اس واقعہ نے بھی ان کے دل پر خاص اثر کیا تھا، لکھتے ہیں :-

”اس وقت میں سررشتہ تعلیم میں سب ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھا اور ہمیر پور کے ضلع میں تعینات تھا۔ کتاب کو نکلے چھپنے ہو چکے تھے۔ ایک دن رات کو میں اپنے کیمپ میں بیٹھا ہوا تھا کہ کلکٹر صاحب کا (جدا ایک انگریز تھے) پروانہ پہنچا کہ فوراً آکر مجھ سے ملو۔ جاڑے کا موسم تھا، میں نے بیل گاڑی جتوئی اور راتوں رات تیس چالیس میل کا سفر طے کر کے دوسرے دن صاحب سے ملا۔ اُن کے سامنے ”سوز وطن“ کی ایک جلد رکھی ہوئی تھی۔ میرا ماتھا ٹھنکا اس وقت میں نواب رائے کے نام سے لکھا کرتا تھا مجھے اس کا کچھ بڑا تہ مل چکا تھا کہ خفیہ پریس اس کتاب کے مصنف کی کھوج میں ہے۔ میں سمجھ گیا کہ ان لوگوں نے مجھے کھوج نکالا، اور صاحب بہادر نے اسی کی جواب دہی کے لئے

مجھے بلایا ہے

صاحب نے مجھ سے پوچھا۔ ”کیا یہ کتاب تم نے لکھی ہے؟“
میں نے کہا ”ہاں“

صاحب نے ایک ایک کہانی کا مجھ سے مطلب پوچھا۔ اور آخر میں بگڑ کر بولے۔

”تمہاری کہانیوں میں سیڈیشن بھرا ہوا ہے۔ اپنی تقدیر پر خوش ہو کہ انگریزی عمل داری میں ہو، مغلوں کا راج ہوتا تو تمہارے دونوں ہاتھ کاٹ دیے جاتے۔ تمہاری کہانیاں یک طرفہ ہیں۔ تم نے انگریزی سرکاس کی توہین کی ہے بغیر آخر کار فیصلہ یہ ہوا کہ میں ”سندھ وطن“ کی کل کہانیاں سرکار کے حوالے کر دوں اور آئندہ صاحب سے اجازت لئے بغیر کچھ نہ لکھوں۔ میں سمجھا کہ چلو سستے چھوٹ گیا۔ کل ہزار کہانیاں چھپی تھیں۔ اور ابھی مشکل سے تین سو جلدیں فروخت ہو سکی تھیں۔ میں نے بقیہ سات سو کہانیاں منگا کر صاحب کی نذر کر دیں۔“

» میں سمجھا بلا ٹل گئی۔ لیکن افسران محکمہ کی اس سے سیری نہ ہوئی، لیکن جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ کلکٹر نے ضلع کے دوسرے افسروں سے بھی میرے بارے میں مشورہ کیا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس، دو ڈپٹی کلکٹر اور ڈپٹی انسپکٹر مارا اس جن کا میں ماتحت تھا میری تقدیر کا فیصلہ کرنے بیٹھے۔ ایک ڈپٹی کلکٹر صاحب نے میری کہانیوں سے ثابت کیا کہ ان میں شروع سے لے کر آخر تک باغیانہ خیالات اور انقلاب انگیز جذبات کے سوا اور کچھ نہیں محکمہ پولیس کے خدام نے کہا کہ ایسا خطرناک آدمی سخت سزا کا مستحق ہے۔ ڈپٹی انسپکٹر صاحب

کو مجھ سے بڑی محبت تھی اس ڈر سے کہ کہیں معاملہ طول نہ پکڑے۔ انھوں نے کہا کہ وہ دوستانہ طریق پر میرے سیاسی خیالات کا پتہ لگا کر کمیٹی کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کریں گے۔ دراصل ان کا ارادہ تھا کہ مجھے سمجھا بھجا کر رپورٹ میں لکھ دیں کہ مصنف صرف قلم کا مرد ہے۔ مگر سیاسی امور سے اُسے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کمیٹی نے اس مشورہ کو پسند کیا حالانکہ پولیس کے خداوند اس وقت بھی پینترے بدلتے رہے۔

معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ لیکن پریم چند نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ انگریزوں کو نہیں بھگتا۔ ادب بھی آزادی کی جدوجہد کو آگے بڑھانے میں زبردست ہتھیار ہے، اور انھوں نے اس ہتھیار کو پہلے سے زیادہ تیز اور موثر بنانے لڑنے رہنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اب لڑائی جاری رکھنے کے لئے انھوں نے جوڈھنگ اختیار کیا۔ اس کا ذکر انھوں نے اپنی کہانی ”رانی سارندھا“ میں کیا ہے، جو انھی دنوں لکھی گئی تھی۔ لکھتے ہیں :-

”دنیا ایک عرصہ کا زار رہے اس میدان میں اسی سپہ دار کو فتح نصیب ہوتی ہے جس کی آنکھیں موقع شناس ہوتی ہیں۔ جو موقع دیکھ کر جتنی ضرورتی اور جوش سے آگے بڑھتا ہے اتنے ہی جوش اور سرگرمی سے خطرے کے مقام پر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ یہ مرد میدان سلطنتیں قائم کرتا اور قومیں بناتا ہے اور تاریخ اس کے نام پر عظمت کے پھول نثار کرتی ہے۔“

نیا بیاہ

میں بیاہ کو رومانی ارتقاء کا ذریعہ
سمجھتا ہوں۔ عورت، مرد کے رشتہ
کا اگر کوئی مطلب ہے تو یہی وہ نہ میں

بیاہ کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا۔ (پریم چند)

دیہات میں اور عموماً شہروں میں بھی صغرسنی کی شادی کا رواج تھا
پریم چند بھی اس رواج کا شکار ہوئے۔ باپ نے ان کی شادی تیرہ چودہ
سال کی عمر میں کر دی تھی، جس کا انھیں سخت افسوس رہا۔ جوان بیوی دل
میں طرح طرح کے ارمان لے کر آئی تھی وہ پورے نہ ہو سکے ادھر پریم چند
کے اپنے ہی ارمان پورے نہ ہوئے تھے، کالج میں پڑھنے کی حسرت

دل میں رہ گئی تھی وہ بیوی کے ارمانوں کا خیال کیا رکھتے ؟ سکول ماسٹر ہوئے تو سوتیلی ماں اور بھائیوں کا بوجھ سر پر اُٹھا۔ بیوی کو اس بات سے بڑی کدھی اور وہ ہمیشہ کڑھتی رہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ خاوند اب کمانے لگا کر وہ خود مختار بنے۔ ہر ماہ کی تنخواہ اسے لا کر دے اور وہ اپنی مرضی سے خرچ کرے۔ مگر گھر میں سوتیلی ماں کا راج رہا اور وہ اپنے آپ کو اس کی دست نگر سمجھتی رہی۔ اس کا غصہ پریم چند پر اُترتا تھا۔

”مستعار گھر میں“ کے ہیرو میں جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ پریم چند کی زندگی کے نقوش صاف جھلکتے ہیں۔ وہ سسرال جاتا ہے وہاں بیوی سے ملاقات کا حال یوں بیان کیا گیا ہے۔

”رات کو دیو بی نے پوچھا۔ ”سب روپے اٹھاؤ گے کچھ بچا بھی ہے؟“ میرا سارا جوشِ الفت سرد پڑ گیا۔ نہ خیر دعا فیت، نہ محبت کے راہِ دنیا شکوے و شکایتیں۔ بس ہائے روپے ہائے روپے۔ جی میں اُسی اسی وقت اُٹھ کر چل دوں۔ لیکن ضبط کر لیا۔ بولا۔ میری آمدنی جو کچھ ہے۔ وہ تو تمہیں معلوم ہی ہے۔

میں کیا جانوں تمہاری آمدنی کیا ہے۔ کمانے ہو گئے اپنے لئے۔ میرے لئے کیا کرتے ہو۔ تمہیں تو جھگڑانے عورت بنایا ہوتا تو اچھا ہوتا۔ رات دن نکلھی، چوٹی کیا کرتے۔ تم ناحق مرو پئے۔ اپنے شوقِ سنگار سے بچتا ہی نہیں تم دوسروں کی کیا فکر کر دے گئے ؟ میں نے جھجھلا کر کہا۔ کیا تمہاری یہی مرضی ہے کہ اسی وقت چلا جاؤں۔

دیوی جی نے تیوریاں چڑھا کر کہا چلے کیوں نہیں جاتے ہیں تو تمھیں بلانے نہ گئی تھی، یا میرے لئے کوئی روکڑ لائے ہو۔

میں نے ملومت آمیز انداز سے کہا۔ تمھاری نگاہ میں محبت کی کوئی قدر نہیں ہے جو کچھ ہے وہ روکڑ ہی ہے۔

دیوی جی نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے کہا۔ محبت اپنے آپ سے کرنے ہو گے۔ مجھ سے تو نہیں کرتے۔

تمھیں پہلے تو یہ شکایت نہ تھی۔

اس سے تمھیں یہ تو سمجھ ہی لینا چاہئے تھا کہ میں روکڑ کی پروا نہیں کرتی لیکن دیکھتی ہوں کہ جوں جوں تمھاری حیثیت بدل رہی ہے، تمھارا دل بھی بدل رہا ہے۔ اس سے تو یہی اچھا تھا کہ تمھاری وہی حالت بنی رہتی۔ میں تمھارے ساتھ فلقے کر سکتی ہوں۔ چتھرے پہن سکتی ہوں، لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ تم چین کرو۔ اور میں میکے میں پڑی تقدیر کو رو یا کروں۔ میری محبت اتنی بے غرض نہیں۔“

اس وقت پریم چند سکول ماسٹر مقرر ہوئے تھے اور اٹھارہ روپے ماہوار تنخواہ تھی۔ ”مستعار گھڑی کا ہیرو ہو رہا ہے پریم چند نہیں ہے لیکن اس کہانی میں اس کی اقتصادی حالت کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے وہ پریم چند کی اپنی حالت سے مختلف نہیں ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس کہانی کا غریب ہیرو اپنے دوست دانو سے گھڑی مانگ کر ادد بن گھن کر سسرال گیا ہے۔ لیکن پریم چند نے شاید کبھی ایسا نہ کیا ہو اور ممکن ہے کہ ایسا کیا بھی ہو۔ اور اس واقعہ کے بعد ہی

ابھیں یہ نصیحت ہوئی ہو کہ دکھانے اور نمود کی ہوس بے سود ہے جب تم واقعی غریب ہو، تو غریب کہلانے میں شرم کیوں؟ اور یوں ہی امیر کہلانے سے حاصل!

اس کہانی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بیوی اپنے میکے یا سوتیلی ساس کے پاس رہنے کی بجائے خیمہ ان کے پاس آکر رہنا چاہتی تھی لیکن غلیل خواہ کے عیش پریم چند ایسا نہ کر سکے۔ لا چاری اور مجبور رہی تھی ادا بنی لا چاریوں اور مجبور یوں کے باعث دلوں میں گرہ پڑتی رہی۔ اور بخشش بڑھتی گئی "نعت" کے کاؤس جی کی کہانی معمولی رد و بدل کے ساتھ پریم چند کی اپنی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ غریب کاؤس جی کا امیر شاپور کی حالت سے یوں مقابلہ کیا ہے۔

"کاؤس جی نے اخبار نکالا، اور شہرت کمائے لگے۔ شاپور جی نے روٹی کی دلائی شروع کی اور دولت کمائے لگے۔ کمائی دونوں ہی کر رہے تھے۔ لیکن شاپور جی خوش تھے، کاؤس جی دل گرفتہ۔ شاپور جی کو عزت کے ساتھ دولت خود بخود مل رہی تھی۔ کاؤس جی کو شہرت کے ساتھ دولت درہن سے دیکھنے پر بھی کہیں نظر نہ آتی تھی۔ اس لئے شاپور جی کی زندگی میں سکون تھا، عافیت تھی، امید تھی، درد تھا اور چہل پہل تھی۔ کاؤس جی کی زندگی میں تلخی تھی، ناگہمی تھی، بایوسی تھی، بے قراری تھی، بے دردی تھی۔ دولت کو حقیر سمجھنے کی دہشت کو شیش کرتے تھے، لیکن جو عیاں تھا اس کی جانب سے آنکھیں بند کر لینا غیر ممکن تھا۔ شاپور جی کے دولت کہہ میں جو فراخ دلی تھی اور مہاں نوازی اور شرف

تھی۔ اس کے مقابلے میں انھیں اپنے گھر کی بے سرو سامانی، تنگ دلی، نزاع اور بدظنی سے نفرت ہوتی تھی۔ شیریں بیان اور خوش خلق مسٹر شاپورجی کے سامنے اپنی گلشن بانو کم ظرف اور حسد کی پتلی معلوم ہوتی تھی، جسے جہانوں گویا کوئی پرغاش ہو، جو سیاہی سی بات بھی کہتی تو طنز اور جگر خراش کنالوں کے ساتھ۔ شاپورجی گھر میں آئے تو شیریں بسم اور گرم جوشی سے اُن کا خیر مقدم کرتی کاؤس جی خود تھکے مانگے، پریشان حال گھر آئے تو گلشن اپنا دکھڑا سنسنے بیچھ جاتی اور ان کو خوب ملامت کرتی۔ تم بھی اپنے کو انسان کہتے ہو، میں تمھیں سیل سمجھتی ہوں، نرا چار پیروں والا بیل، بیل بڑا غریب ہے سیدھا ہے، محنتی ہے، صابر ہے، مانا، پھر اُسے شادی کرنے کا کیا حق ہو گاؤس جی سے ایک لاکھ بار یہ سوال کیا جا چکا تھا۔ جب تمھیں اخبار نکال کر اپنی زندگی برباد کرئی تھی تو تم نے شادی کیوں کی۔ اپنے ساتھ مجھے کیوں سے ڈوبے۔ جب تمھارے گھر میں دردِ دہائیاں نہ تھیں تو مجھے کیوں لائے۔ اس سوال کا جواب دینے کی غریب کاؤس میں ہمت نہ تھی، نہ طاقت اور نہ صلاحیت۔ انھیں کوئی جواب بھی نہ سوجھتا تھا، وہ غمزدہ اپنی غلطی پر کھپکتے تھے۔

مگر پریم چند کے معاملے میں غلطی خود انھوں نے نہیں بلکہ ان کے والد ششی عجائب لال نے کی تھی، اور اس معاملے میں پریم چند نے اُن کی بات ٹھیک ہی لکھا ہے کہ آخری عمر میں خود بھی ٹھوکر کھائی اور ایک دھکا دے کر اُنھیں بھی گرا دیا۔ لیکن پریم چند غلطیوں پر صرف کھپکانے رہنے اور مایوس ہو جانے والے آدمی نہیں تھے۔ وہ انسانی کمزوریوں کو سمجھتے تھے اور یہ بھی

جلنتے تھے کہ محبت محض خلاء میں نہیں چل سکتی۔ اس کے لئے بھی غذا کی ضرورت ہے، اور شرافت یا کم ظرفی بھی انسان کی جبلت یا فطرت نہیں، ماحول کی پیداوار ہے۔ تلخی اور طعن و تشنیع کی طاقت خراب مادی حالات سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے وہ تلخ کلامی کے لئے بیوی کو مورد الزام نہیں ٹھہراتے تھے اور ہمیشہ مفاہمت اور مصالحت کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ لیکن مفاہمت کی کوئی صورت پیدا نہ ہوتے دیکھ کر انھیں واقعی دکھ ہوتا تھا۔

مصالحت نہ ہو سکنے کی صورت میں ایک ہی چارہ کار رہ جاتا تھا، کہ وہ بیوی کو چھوڑ دیں اور اس سے ہمیشہ کے لئے کنارہ کش ہو جائیں۔ پریم جیبر جیسے نیک نفس اور انسان دوست شخص کے لئے یہ کام یہ قدر اٹھانا ممکن نہیں تھا۔ وہ اس سماج میں عورت کو سب سے زیادہ مظلوم سمجھتے تھے اور وہ اپنے ناولوں اور کہانیوں میں عورتوں پر مصلحت کی زیادتی کے خلاف احتجاج کرتے رہے۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اپنی عورت سے ایک دم قطع تعلق کر لیں، اسی لعنت "کہانی میں کاؤس جی بیوی کے ساتھ اپنی بے مرضی اور بے اعتنائی پر پھبتاتے ہوئے سوچ رہے ہیں۔ "ان کی حق پر دہی اور عالی نفسی کیا محض تحریروں کے لئے وقف ہے؟ محض ان کے لئے سبوتاژ ہے دور ہیں، بے تعلق ہیں؟"

بیوی کے متعلق ان کے دل میں سوال پیدا ہوتا تھا "چھوڑیں، نہ چھوڑیں" اور ایک عرصے تک اس کش مکش میں مبتلا رہے۔ ان کی ذہنی کیفیت کو سمجھنے کے لئے مرد اور عورت کے تعلقات کے متعلق ان کے نظریے

کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ اس کے لئے صرف ایک دو مثالیں کافی ہوں گی۔ حت
 "لعنت" کہانی ہی کو لیجئے، اس میں انھوں نے اپنے نظریے کی خوب ضا
 کی ہے۔ اس کہانی میں ایک ٹکڑا دیکھئے۔ شاہ پرچی رات بھر رنگ رلیاں
 منانے کے بعد لوٹتے ہیں۔ وہاں کاؤس جی ملتے ہیں تو انھیں بتاتے ہیں کہ
 وہاں کھانے میں دیر ہو گئی۔ لیکن کاؤس جی نے جیسا کہ اخبار نویسوں کا طہرہ
 ہے کہ وہ بات ہی نہیں پوچھتے۔ بچوں کی طرح بات کی جڑ بھی کھد جتے ہیں، دریافت
 کیا کہ "دعوت میں میرا بن کون صاحب تھے؟"
 جواب ملا "مس گوہر"
 "مس گوہر"

"جی ہاں، وہی، آپ چونکے کیوں؟ کیا آپ اسے تسلیم نہیں کرتے
 کہ دن بھر کے درد سہرائے بعد مجھے تازہ ہونے کے لئے کچھ تفریح کی بھی ضرورت
 ہے۔ ورنہ یہ زندگی عذاب ہو جائے۔"
 کاؤس جی نے زاہدانہ استحقاق کے ساتھ کہا۔ "میں اسے نہیں مانتا"
 "کیوں؟"
 اس لئے کہ میں کسی قسم کی نفسیاتی تفریح کو اپنی منکر ص کے ساتھ بے نصاف
 سمجھتا ہوں۔"

شاہ پرچی ہنستے، ایک پر معذرت انداز کے ساتھ بولے "مہی قیا تو
 خیال"
 کاؤس جی نے جوش کے ساتھ کہا "آپ کو واضح ہونا چاہئے کہ آج کی

”پریم چند اپنی زندگی امن و سکون سے بسر کرنا چاہتے تھے۔ وہ نہ خود کسی کے ساتھ سختی کرنا پسند کرتے اور نہ کسی کی کوئی کرمی بات برداشت کر سکتے تھے۔ نجی معاملات میں وہ ہمیشہ اعتدال پر قائم رہنا چاہتے تھے۔ ان کی سب سے بڑی آزمائش شادی کے موقع پر ہوئی۔ جہاں تک معلوم ہو سکا ہے ان کی پہلی بیوی بہت بدسلوک تھیں۔ جس کی وجہ سے ان کی زندگی تلخ ہو گئی تھی۔ آٹے دن کے جھگڑوں کے علاوہ کچھ اور واقعات بھی پیش آئے جن کے سبب سے مصالحت کا کوئی موقع باقی نہ رہا۔ جب انھوں نے مجھے مفصل حالات بتائے تو میں بھی انھیں الزام نہ دے سکا۔ اتفاق سے اس بارے میں ان کا ایک خط محفوظ رہ گیا ہے۔ جس پر کوئی تاریخ نہیں ہے۔ یہ یقیناً ۱۹۵۹ء کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

”برادر م، اپنی بیٹی کس سے کہوں۔ ضبط کئے کئے کوفت ہو رہی ہے، جوں توں کر کے ایک عشرہ کاٹا تھا کہ خانگی ترددات کا تانتا بندھا..... بیوی صاحبہ نے ضد پکڑی کہ یہاں نہ رہوں گی، نیکے جاؤں گی۔ میرے پاس روپیہ نہ تھا۔ ناچار کھیت کا منافع وصول کیا۔ ان کی رخصتی کی تیاری کی وہ رو دھو کر چلی گئیں۔ میں نے پہچانا بھی پسند نہ کیا۔ آج ان کو گئے آٹھ روز ہو گئے، نہ خط نہ پتر۔ میں ان سے پہلے ہی ناخوش تھا اب تو صورت سے بیزار ہوں، غالباً اب کی ان کی بدائی دائمی ثابت ہو، خدا کرے ایسا ہی ہو۔ میں بلا بیوی کے رہوں گا۔ ادھر نا اہل کی طرف سے اور والدہ کی طرف سے ضد ہے کہ بیاہ رچے اور ضرور رچے۔ جب کہتا ہوں مفلس

ہوں..... تو والدہ کہتی ہیں کہ تم اپنی رضا مندی دے دو۔ تم سے ایک کوڑی نہ مانگی جائے گی۔ بہر حال اب کی تو کٹا چھڑا ہی لوں گا۔ سینہ کی بات نارائن کے ہاتھ ہے۔ جیسی آپ کی صلاح ہوگی ویسا کروں گا۔ اس بارے میں ابھی پھر مشورہ کرنے کی ضرورت باقی ہے۔“

اس خط میں سوتیلی ماں کا ذکر ہے جس سے ظاہر ہے کہ بیوی سے زیادہ ان کی چاچی یعنی سوتیلی ماں سے بڑی تھی اور اس سے پہلی سی کدورت نہ رہ گئی تھی۔ ”خانہ داماد“ کہانی میں سوتیلی ماں کے بارے میں یہی رائے ظاہر کی گئی ہے۔ ایک کسان ہری دھن سے کہتا ہے، تم نئی اماں سے ناک دناں، دیرتے تھے۔ بڑی سیدھی ہیں بے چاری، بس اپنی اماں ہی سمجھو تھیں پا کر تو نہال ہی ہو جائیں گی۔“

ہری دھن سوتیلی ماں کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اس لئے سسرال میں حاکم رہنے لگا۔ جو روپیہ پیسہ ساتھ لے گیا تھا اس کے ختم ہونے پر ساس، سولے اور خداس کی بیوی گمانی اس سے نفرت کرنے لگی سارا دن گھر کا اور باہر کا کام کرتا تھا۔ پھر بھی نوکروں سے بدتر سلوک ہوتا تھا اور پیٹ بھر کھانے کو نہیں ملتا تھا۔ عاجزا کرا اس نے سسرال کا گھر چھوڑ دیا، بیوی سے ساتھ چلنے کو کہا، لیکن وہ مفلس خاوند کا ساتھ دینے کو تیار نہ ہوئی۔ یہی کسان جو ہری دھن کو سسرال سے آئے ہوئے رستے میں مل گیا تھا پوچھتا ہے —

”اچھا گھر والی کی بھی تو لاؤ گے؟“

ہری دھن۔ اس کا منہ اب نہ دیکھوں گا، میرے لئے وہ مر گئی۔

منگرو۔ (کسان کا نام)۔ تو دوسری سگائی ہو جائے گی۔ اب کے ایسی عورت
لا دوں گا کہ اس کے پیر دھو کر پیو گے۔ پر کہیں پہلی آگئی تو؟
ہری دھن۔ وہ نہ آئے گی۔

پریم چند نے بھی دوسری شادی کر لی۔ لیکن دوسری شادی میں بھی انھوں
نے جس اصول پرستی کا ثبوت دیا تھا، قابلِ تعریف ہی۔ دیا نرائن نگم لکھتے ہیں:-
”..... شادی کے متعلق بڑے غور و خوض اور بہت کچھ بحث و
مباحثہ کے بعد انھوں نے طے کیا کہ دوسری شادی طے کی جائے تو کسی بیوہ
ہی سے کی جائے۔“

پریم چند کا اس وقت عالم شباب تھا اور وہ ایک ہنس مکھ، زندہ
دل، خوش رو و تندرست اور کھلتے پیتے نوجوان تھے۔ سری واسکو فرنا
میں جس سے اُن کا تعلق تھا۔ قرار داد کی رسم عام ہے۔ اور ہزار دو ہزار نقد تو
اُن کو آسانی سے مل سکتا تھا اور یہ رقم اس وقت تک ان کے لئے ایک بڑی رقم
تھی۔ اُن کے اہل خاندان بیوہ بیاہ کے خلاف تھے۔ مگر وہ اپنے فیصلے پر
اُل رہے۔ اور ضلع فتح پور میں موضع سلیم پور (کنوارا) میں شریعتی شورانی
دیوی کے ساتھ اُن کی دوسری شادی ہو گئی.....“

شریعتی شورانی دیوی کی شادی اتنی چھوٹی عمر میں کر دی گئی تھی کہ وہ
بچپن ہی میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ شورانی دیوی اب بھو زندہ ہیں اور بیوی بھی
عورت ہیں۔ پریم چند کی ان سے خوب نہیں۔ مگر پہلی بیوی جتنے عرصہ زندہ رہیں
وہ اُسے ماہانہ خرچ بھیجتے رہے مگر قطع تعلق ہونے کا انھیں ساری عمر بچ

چراغ میں تیل ڈال کر اسے اور تیز کرنا ہے۔ اگر چراغ کی روشنی تیز نہ ہو تو تیل
 ڈالنے سے کیا فائدہ ہے؟“

استغفار

ہمارے غیر معمولی کام فیصلوں سے نہیں
ہوا کرتے۔ ہم آخر وقت تک شش و
بیخ میں رہتے ہیں۔ (پریم چند)

ہمیر پور میں پریم چند اکثر بیمار رہتے تھے۔ وہاں کھانے پینے کا ٹھیک
انتظام نہیں تھا جس کی وجہ سے انھیں ایک مرتبہ کئی روز تک خشک رومی
کھانی پڑی۔ ایک دن پیٹ میں ایسا درد ہوا کہ تمام دن مچھلی کی طرح تڑپتے
رہے، نکھتے ہیں۔ ”چورن کھایا، پیٹ پر گرم بوتل بھیر می، جاسن کا
عرق پیا، غرض دیہات میں جتنی دوائیں مل سکتی تھیں سب کھائیں۔ لیکن درد
کم نہ ہوا۔ دوسرے دن سچیش ہو گئی۔ لیکن درد جاتا رہا۔“

پریم چند اچھا کھانا سنانے دیکھ کر ضبط نہ کر سکتے تھے۔ اس وقت کے ایک ماہ بعد جب وہ دورے پر تھے تو ایک تھانہ میں ٹھہرنا ہوا۔ داروغہ نے اُن کی خوب آؤ بھگت کی۔ زمین قند پکویا، دہی بڑے، پکوڑیاں، پلاؤ سب کچھ بنوایا اور پریم چند نے بھی خاص طور پر کھایا۔ لیکن جب کھانے کے سونے تو دھائی گھنٹے بعد ہی پیٹ میں شدید قسم کا درد پیدا ہو گیا سوئی کی دو بوتلیں پینے کے بعد قے ہوئی، تب کہیں درد کو آرام ہوا، لیکن پشیم کی دائمی شکایت رہنے لگی۔ یہ ساری زمین قند کی خرابی تھی۔ اس روز سے پریم چند زمین قند اور اروی کے پاس تک نہیں بھٹکے، صورت دیکھ کر کانپ جلتے تھے۔

پریم چند نے اس مرض کے باعث سلاطینہ میں تبادلے کی درخواست دی، خیال تھا کہ کسی اچھی جگہ تبادلہ ہو گا لیکن انھیں بستی کے ضلع میں ٹپکا گیا، یہ حلقہ نیپال کی ترائی کے قریب ہے، یہاں اگر پشیم کی شکایت اور بڑھ گئی، اور پھر دور دراز علاقے میں پڑھے لکھے لوگوں کی صحبت بھی نہ رہی۔ لیکن ڈمریا گنج کے تحصیل دار پنڈت منن دویدی گجپوری زندہ دل آدمی تھے ادب اور علمی مسائل سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ پریم چند اور ان میں خوب علمی مباحث رہتے تھے۔ یہیں سے انھوں نے ”اناتھ لڑکی“ ”خون سفید“، ”شکاری اور راج کمار“، ”شامت اعمال“، ”غیرت کی کٹار“ اور ”مرسم“ وغیرہ کہانیاں لکھیں۔ ان قصوں کا مواد تاریخ سے حاصل نہیں کیا گیا۔ لیکن اس زمانے کا فوق علمیت اور تجسس جھلکتا ہے۔

پیشِ آخر ناقابلِ برداشت ہو گئی۔ تب وہ چھ ماہ کی چھٹی لے کر لکھنؤ آئے اور میڈیکل کالج میں علاج کراتے رہے۔ کچھ فائدہ نہ ہوا تو بنارس کر ایک حکیم کا علاج شروع کیا۔ تین چار مہینے کے مسلسل علاج سے فائدہ نہ ہوا، لیکن بیماری جڑ سے نہیں گئی، کیونکہ جب چھٹی ختم ہونے پر واپس بستی میں آئے تو پھر وہی حالت ہو گئی، اُن کے لئے دوروں پر جانا ممکن نہیں رہا، اس لئے مدرسہ پر جانے کی درخواست دی۔

اس کے علاوہ گھر کے ترددات بھی بڑھ گئے تھے۔ پہلے ان کے ایک عزیز جے نارائن لال اُن کے ساتھ رہتے تھے۔ انھیں لکھنے پڑھنے کا بھی شوق تھا۔ پریم چند کو اُن کا بڑا سہارا تھا گو انھیں اکثر دورے پر رہنا پڑتا تھا۔ لیکن ان کی وجہ سے گھر کی طرف سے بے فکر رہتے تھے، لیکن وہ خفیف علالت کے بعد ہو باہی میں چل بسے۔ ۱۹۱۵ء میں ایک دوست کو ہو باہی سے ایک خط میں لکھا:-

”اس صدمے سے کمر ٹوٹ گئی، ہمت پست ہو گئی۔ جس انسپکٹری کو بڑی آرزوؤں اور تمناؤں کے بعد حاصل کیا تھا وہی اب جی کا جہال ہو رہی ہے۔ بیوی کو تنہا چھوڑ کر دورے پر کیسے جاؤں.....“

جولائی ۱۹۱۵ء میں وہ گورنمنٹ اسکول بستی کے اسٹنٹ ٹیچر مقرر ہو گئے اور تین سال تک نہایت قیام رہا۔ دوروں سے فرصت پا کر وہ ادب اور تصنیف کی طرف زیادہ مائل ہوئے ”سر پر غور“، ”دھوکا“، ”دوبھائی“، ”بیٹی کا دھن“، ”پنچایت“، ”جگنو کی چمک“ اور ”شعلہ حسن“

وغیرہ کہانیاں ان دنوں لکھیں۔ ان کہانیوں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عوام سے ان کا تعلق گہرا ہو گیا تھا اور ان کی اچھائی اور عظمت میں ان کا اعتماد بہت بڑھ گیا تھا۔

اگرست سلسلہء عمر میں وہ بستی سے گورکھ پور آئے وہاں ان کا تعارف ہما بیر پرشاد دیت دار سے ہو گیا۔ وہ مہندی لٹریچر کے بڑے عالم، دانشور اور بڑے جفاکش و محنتی شخص تھے۔ پریم چند نے ان کی صحبت سے کافی فیض حاصل کیا۔ ان دنوں پریم چند نے خود بھی مہندی میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ان کا ناول "سیواسدن" (بازار حسن) جو غالباً سلسلہء عمر میں چھپا تھا بہت مقبول ہوا۔ اس سے پہلے بھی مہندی میں ان کی کچھ کہانیاں اور دو تین ناول چھپ چکے تھے، لیکن "سیواسدن" لکھ کر انھوں نے اپنا نام منوالیا۔

اس مقبولیت اور حوصلہ افزائی سے متاثر ہو کر انھوں نے اپنا پہلا طویل ناول "پریم آشرم" یعنی گوشہء عاقبت لکھنا شروع کیا۔ اس ناول میں اس زمانے کے دیہات کی صحیح اور پوری تصویر آجائی ہے، اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ پریم چند کو اپنے دلبس کے غریب اور بے کس کسانوں سے کتنی ہمدردی تھی، اور وہ کس طرح ان کے لئے سوسراج اور خوش حالی کے خواب دیکھتے تھے۔

انگریزی سامراج کی لوٹ کھسوٹ کے باعث ہمارے دیہاتوں کا پرانا ڈھانچہ بالکل ٹوٹ گیا تھا۔ اس پہلے بھی حکومتیں بدلیں، لیکن ان کا دیہات پر کچھ اثر نہیں پڑا، اگر پڑا تو بالکل معمولی۔ انھیں حکومت سے کوئی تعلق نہیں

تھا وہ الگ تھلگ رہتے تھے جس کی وجہ سے اُن میں قدامت پسندی، اور توہم پرستی ضرور پیدا ہو گئی تھی لیکن ایک طرح کی خوش حالی اور خود کفالتی تھی۔ پھر آپس کا میل جول، اتحاد اور فطری محبت اور عظمت تھی۔

انگریزی سامراج یہاں تجارت کی غرض سے آیا تھا۔ چنانچہ دیہات انگریزی تاجروں کی دست برد سے نہ بچ سکے۔ تجارت کو فروغ دینے اور حکومت کو اچھی طرح چلانے کی غرض ہی سے نقل و حرکت کے سلسلوں میں توسیع کی گئی۔ ریل، ڈاک اور تار کے محکمے قائم کئے گئے۔ ان سب چیزوں کا اثر دیہاتی زندگی پر پڑا۔ ظاہر ہے کہ اب وہ الگ تھلک نہیں رہ سکتے تھے، ان کی خود کفالتی بھی ختم ہو گئی۔ یہ ایک طرح اچھا ہی تھا۔ کیونکہ اس سے تہذیب کی نئی قدیں بنتیں، ان کی توہم پرستی ٹوٹی۔ مشینوں کے ساتھ جو نئی تہذیب آئی تھی، دیہاتی بھی اس سے روشناس ہوئے۔

لیکن انگریزوں نے یہ سب کچھ نہیں ہونے دیا۔ سارے ملک کو اپنے تسلط میں لاکر دیہات میں پانا جاگیرداری نظام قائم رہے دیا۔ ہندوستان میں مشینی صنعت کا تو ذکر ہی کیا۔ دیہات میں جو گھریلو صنعتیں اور دستکاریاں تھیں، انھیں بھی تباہ کر دیا۔ ہندوستان کو برطانیہ میں جلنے والے کارخانوں کے لئے صرف کچا مال مہیا کرنا ہوتا تھا، جو انگریز حکمران طبقہ بہت سستے داموں لیتا تھا اور اس کے مقابلے میں برطانیہ کا بنا ہوا مشینی مال بہت مہنگا بکتا تھا۔ جس کی وجہ سے کسانوں کی حالت دن بدن خراب ہوتی گئی۔ خود برطانوی ماہرین اقتصادیات کا کہنا ہے کہ انیسویں صدی

آخر اودھیسویں صدی کے آغاز تک ہندوستان کی پہلی خوش حالی صنائع ہو گئی تھی اور دیہات کی حالت بہت خستہ تھی۔ رحمتی پام دت اپنی کتاب ”ہندوستان“ میں اس حالت کے متعلق ایک انگریز موزرخ ایم ایل ڈارلنگ کے حوالے سے لکھتے ہیں :

”ہندوستان کے بارے میں سب سے حیرت ناک بات یہ ہے کہ اس کی مٹی زرخیز ہے اور اس کے باشندے مفلس۔“

اس کے علاوہ ان پر براہِ راست پڑنے والے ٹیکسوں کا بار بھی بڑھ گیا تھا۔ مغلوں کے زمانے میں جن لوگوں کو زمین کا لگان وصول کرنے کے لئے علاقوں کے مختار مقرر کیا گیا تھا انگریزوں نے انھیں زمیندار بنادیا۔ اس سے ان کی سلطنت کی جڑیں مضبوط ہوتی تھیں۔ یہ لوگ زمین کے مالک تھے کسان مزارعے تھے۔ زمیندار طرح طرح کے کرا دیہیکس وصول کرتے تھے۔ مختار اور گلشنے کسانوں کو الگ بوٹتے تھے۔ اس کے علاوہ سرکاری افسر ڈپٹی کمشنر سے لے کر تحصیل دار تک دیہات کو اپنی بوٹ کھسٹ سے مفلس بنا رہے تھے۔ پٹواریوں، چھوٹے پیادوں اور چوکی داروں کا تو ذکر ہی کیا، وہ تو کسان کے جسم سے مستقل طور پر چسپی رہنے والی جنکیں تھیں ایسے میں پھر کسان کیسے پنپ سکتا تھا۔ اس کی مصیبتوں کا کیا ٹھکانا معمولی معمولی خواہشات دل میں گھٹ کر رہ جاتی تھیں۔ اس کی نا آسودہ تمنائیں اس کی شخصیت کو کچل رہی تھیں اور دل میں جو الاکھی پتار ہوتا تھا۔

ان باتوں کا ذکر اس لئے ضروری تھا کہ اس پس منظر کو مد نظر رکھ کر

پریم چند کو سمجھے نہیں آسانی ہوتی ہے۔ چونکہ وہ دیہات میں پیدا ہوئے تھے اور اب دودھ کے باعث اکثر دیہات میں رہنا ہوتا تھا۔ اس لئے وہ اپنے دس کے دیہاتی عوام سے اور ان کی مشکلات سے اچھی طرح روشناس ہو گئے تھے بقول صحفے انھوں نے اپنے عوام کو سونگہ کر دیکھا تھا، انھیں اچھی طرح پہچان لیا تھا۔

ملازمت کے باعث ان کا واسطہ حکام سے اور پڑھے لکھے طبقے سے بھی پڑتا تھا۔ اپنے عوام سے ان کی سرمدہری اور بے دردی دیکھ کر پریم چند کو بڑا سنجھوتا تھا۔ کیا جج، کیا وکیل، اور کیا ڈاکٹر سب پیسوں کے لئے غریبوں کا گلا کاٹنے والے، پیسے کے لئے ضمیر کا خون کرنے والے، نفس پرست اور خود غرض لوگ تھے۔ میدانِ عمل میں لکھتے ہیں — ”اتنی عدالتوں کی کیا ضرورت ہے۔ اتنے محکمے کس لئے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غریبوں کی لاشیں نیچے والے گدھوں کا غول ہے۔ جس کی تعلیم جتنی اونچی ہے۔ اس کی حرص اسی مناسبت سے بڑھی ہوئی ہے۔ اگر اس دنیا کو انسان نے بنایا ہے تو انصاف کا خون کیا ہے۔ خدا نے بنایا ہے تو اسے کیا کہیں۔“

ملازمت کے زمانے میں یہ احساس پریم چند کے دل میں بڑی شدت سے پیدا ہو گیا تھا۔ عدالت، افسر اور زمیندار امدان کے پیادے سب کسانوں کو لوٹتے تھے۔ اور پھر سود خور مہاجن تھے جن کی پشت پناہ بھی یہی سرکار اور عدالتیں تھیں۔ ایک طرف غریب کسان تھے جو دن رات محنت کرتے تھے اور پوری تنہی سے تخلیقی عمل میں منہمک تھے۔ دوسری

وطن خود غرض اور نیکے لوگوں کا یہ غول تھا جو کسانوں کی ہڈیاں تک چبا جائے
 کے لئے گدھوں کی طرح ان کے سروں پر منڈلاتا رہتا تھا۔ پھر اس کے
 بعد پہلی عالم گیر جنگ شروع ہو گئی۔ جنگ کی تباہ کاریاں صرف یہی نہیں
 کہ بیش قیمت انسانی جانیں تلف ہوتی ہیں، ہزاروں لاکھوں بچے یتیم اور
 عورتیں بیوہ ہوتی ہیں۔ خوب صورت شہر اور عمارتیں اُجڑ جاتی ہیں، ادب
 اور تہذیب کے خزانے، لائبریریاں خاک میں مل جاتی ہیں، بلکہ تمام محنت
 کش طبقہ پر عرصہ حیات تنگ ہو جاتا ہے۔ حکومت لوٹ چھاپ کر
 اس کی محنت پر ڈاکہ ڈالتی ہے مشینی مال اور بھی مہنگا ہو جاتا ہے۔ جو جنگ
 میں اناج کے دام بھی بڑھے تھے، لیکن اس سے زمینداروں اور امیر
 کسانوں کو فائدہ پہنچا تھا۔ لیکن غریب کسانوں اور فرارعوں کا مہنگائی کے مارے
 کچھ مر نکل گیا۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ کے باعث ملک میں آزادی کی جنگ
 بھی تیز ہو گئی۔ ہر ایک جنگ جہاں عوام کا کچھ مر نکالتی ہے وہاں انھیں
 بیدار بھی کرتی ہے۔ بقاء حیات کے لئے جدوجہد تیز ہو جاتی ہے۔
 پریم چند نے لوٹ کھسوٹ کے اس نظام کو پوری طرح سمجھ لیا تھا
 ان کی ہمدردی ہمیشہ عوام کے ساتھ رہی۔ وہ سرکاری ملازم ہونے ہوئے
 بھی کبھی حاکم طبقہ کے ساتھی نہیں بنے۔ پڑھے لکھے طبقے کے جو خیر غرض
 لوگ عام طور پر عوام کو جاہل، بے وقوف اور غلیظ کہہ کر نفرت کا اظہار
 کرتے ہیں۔ پریم چند انھیں بہت ہی ذلیل اور کمینے سمجھتے تھے۔ انھوں
 نے عوام کی بے لوث محبت، قربانی، ایثار اور مصیبتیں برداشت کرنے کی

صلاحیت کو سمجھ لیا تھا۔ وہ ہمیشہ اُن کی عظمت کو ابھارتے اور محرک کرتے تھے۔ اگر ان میں کچھ کمزوریاں تھیں تو یہ اُن کی اپنی نہیں تھیں، نظام کی پیدا کردہ تھیں۔ اپنی ایک کہانی مٹوٹھ میں لکھتے ہیں — ”جس کا خانہ آرزو ہمیشہ اندھیرا رہا ہو جس کی خواہشیں کبھی مسکراتی نہ ہوں اس کی نیت خام ہوگی تو تعجب کی بات نہیں“

یہ حقیقت ان کی تمام کہانیوں اور ناولوں میں کار فرما ہے، وہ کبھی نظر تقاضوں سے انحراف نہیں کرتے۔ وہ انسانی کمزوریوں کو سمجھتے ہیں اور اُن سے بے پایاں ہمدردی رکھتے ہیں۔ اور جو مسلج ان کمزوریوں کے لئے ذمے دار ہے۔ اس پر ہر پہلو سے بھرپور چوٹ کرتے ہیں۔ انہی دلوں کی ایک کہانی ”انا تھ لڑکی“ ہے۔ اس کا ایک کردار کہتا ہے :-

”باپ قرض کھا کر مر جائے، لڑکا کوڑی کوڑی بھرے، علماء کے نزدیک یہ انصاف ہے۔ میں اسے ظلم کہتا ہوں۔ اس انصاف کے پردے میں گانٹھ کے پورے ہماجن کی دست درازی صاف نظر آتی ہے۔“

چند فقرہ میں روایت، حکومت، مذہبی ریاکاری اور سود خوری سب کو تباہ دیا۔ سماجی، سیاسی اور اقتصادی قوتوں اور ان کے باہمی گٹھ بندھن کو سمجھ لینے کے بعد ہی یہ شعور پیدا ہوتا ہے۔ ”پریم اشرم“ یعنی گوشہ عافیت میں پریم چند نے اس بیدار شعور کے ساتھ زندگی کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔

یہ ناول ”بازار حسن“ یعنی سیواسدن سے دو قدم آگے جا تا ہے

اس ناول میں اقتصادی مسائل سے اچھی طرح بحث کی گئی اور طبقاتی کشمکش پوری شدت کے ساتھ ابھر کر سامنے آئی ہے۔ اس میں دو طرح کے کسان دکھائے گئے ہیں۔ ایک سمجھوتہ کرنے والے ہیں اور دوسرے لڑنے والے لیکن لوٹ کھسوٹ سے دونوں ہی عاجز آچکے ہیں۔ لاوا اندر ہی اندر پک رہا ہے۔ لیگان دھولی کے دنوں میں زمیندار کے کارندوں کی زیادتیاں سہہ کر بغاوت کا جذبہ انتہا پر پہنچ جاتا ہے۔ ابھی دنوں لڑاکو کسانوں کے رہنما منوہر کو پتہ چلتا ہے کہ زمیندار گیان شنکر کے کارندے غوث خاں نے اس کی بیوی کی بے عزتی کی ہے۔ وہ آپے سے باہر ہو جاتا ہے اس کے اندر کا لاوا پھوٹ نکلتا ہے۔ اقتدار پسند طبقے اور اس کی پشت پناہ حکومت نے اس کے اندر جو جھجک پیدا کر رکھی تھی وہ ایک دم دور ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے بیٹے بلراج کو سمجھاتا ہے۔

”کوئی پروا نہیں کھاڑا ہاتھ میں لوگے تو سب ٹھیک ہو جائے گا تم میرے بیٹے ہو، تمہارا کلیجہ مضبوط ہے، تمہیں ابھی جو ڈر لگ رہا ہے وہ تاپ کے پہلے کا جاڑا ہے۔ تم نے کھاڑا لندھے پر رکھا۔ جاہیر کا نام لے کر ادھر چلے تو تمہاری آنکھوں سے چنگا ریاں نکلنے لگیں گی“

اب غوث خاں کے قتل کے بعد نہ صرف منوہر لال اور اس کے بیٹے کو بلکہ تمام گاؤں کو باندھ لیا جاتا ہے۔ زمیندار گیان شنکر اور اس کی امداد کرنے والی سرکاری فوج اس کے بعد کسانوں پر جو ظلم ڈھاتی ہے، خود غرض ٹاکٹر اور وکیل جو جھوٹی شہادتیں دیتے ہیں۔ اس سے تمام سماج دو طبقوں میں

منقسم ہوا صاف نظر آتا ہے اس ظلم کو دیکھ کر کسانوں کے دل کانپ جاتے ہیں اور وہ منور کو لعنت ملامت کرتے ہیں۔ اس موقع پر سب سے دانش ور اور نرم دل کسان قادر اُن سے کہتا ہے :-

”یاد ایسی باتیں نہ کرو، بے چارے نے تم لوگوں کے لئے، تمہارے حقوق کی حفاظت کے لئے یہ سب کچھ کیا ہے۔ اس کے جیوٹ اور مہیاؤ کی تعریف تو نہیں کرتے اٹا اس کی برائی کرتے ہو یہ سب کے سب ڈرپوک ہیں، وہی ایک مرد ہے۔“

یہ قادر کی آواز پریم چند کی اپنی آواز ہے۔ یہی آواز اُس کے چل کر باعمل ہو جاتی ہے اور پریم چند اس جدوجہد میں پوری طرح کسانوں کا ساتھ دیتا ہے۔ گاؤں کی عورتیں منور کی بیوی بلاسی کو طعنے دیتی ہیں کہ تو نے ہمارے گاؤں کا ستیا ناس کر لیا تو اگر ذرا غم کھا جاتی منور سے شکایت نہ کرتی تو گاؤں پر یہ تباہی تو نہ آتی۔ بلاسی بے چاری ٹھکے میں پڑی ہوئی ہے۔ وہ سچی ہے کہ شاید واقعی برا ہوا، زمیندار اور حکومت کا مقابلہ کون کر سکتا ہے لیکن اس موقع پر ٹنگھوچ دھری آپہنچتا ہے اور وہ بلاسی کی دھارس بندھانے ہوئے کہتا ہے کہ تیرا منور سو رہا ہے۔ اس نے گاؤں کی مر جاد بچائی ہے میں یہاں ایک مندر بنواؤں گا جس میں منور کی مورتی لگائی جائے گی اس سے بلاسی کو منور کے فعل کی صداقت اور عظمت کا یقین ہو جاتا ہے اور وہ فخر سے گردن بلند کر لیتی ہے۔

غوث خاں کے بعد فیض خاں کو نیا کارندہ مقرر کر دیا گیا ہے وہ اب

گھاؤں پر طرح طرح کے ظلم ڈھارہا ہے۔ وہ لگان وصولی کی ترقی لے آیا ہے اور سب کچھ قرق کر رہا ہے۔ سکھو جو دھری اُسے لگان کا بے پیر دے کر ظلم بند کرنا چاہتا ہے تو وہ عدالت کے خورچے کے نام پر بڑی رقم طلب کرتا ہے۔ اب پریم چند لکھتے ہیں:-

”ستیاگرہ میں تشدد کو مغلوب کرنے کی طاقت ہے۔ یہ خیال غلط ثابت ہوا۔“ اور

”دفعاً جو دھری نے اپنا چٹنا اٹھایا اور اتنی زور سے فیض اللہ کے سر پر مارا کہ وہ زمین پر گر پڑا۔ پھر بولے یہی عدالت کا خرم ہے۔ جی چاہے اور بے لے ایمان، پانی کہیں کا، کا زندہ بنا پھر تا ہے۔“

پریم چند کے ذہن میں یہ جدوجہد چل رہی تھی۔ ”بازار حسن“ میں وہ بالکل اصلاح پسند تھے۔ ساری کانگریس تحریک اصلاح پسند تھی۔ گاندھی سے پہلے بھی کانگریس کے جو رہنما تھے وہ بھی سماج کو بدنام نہیں جانتے تھے۔ ان کی لڑائی سماج کے طبقاتی ظلم کے خلاف نہیں بلکہ صرف انگریزی سامراج کے خلاف تھی۔ انگریزوں نے اگر ملک کو مفلس بنایا تھا تو وہ انگریزوں سے پہلے کے ہندوستان کو سونے کی چڑیا کہہ کر اور دودھ کی نہروں کی کہانیاں سن کر یہ غلط تصور پیدا کر رہے تھے کہ صرف انگریزوں کو ہٹانے یا ان سے کچھ مراعات حاصل کر لینے ہی سے پھر پرانی خوش حالی لوٹ آئے گی۔ لیکن پریم چند صرف انہی سی تبدیلی کو اس بیماری کا علاج نہیں سمجھتے تھے انہی اس وقت بالکل نیا شعور پیدا ہو رہا تھا۔ وہ بغاوت کی راہ پر چلے

تھے۔ اُن میں جو ذہنی تبدیلیاں ہو رہی تھیں وہ تبدیلیاں انھوں نے اس ناول کے اصلاح پسند اور انسان دوست کردار پریم شنکر میں ظہور پذیر ہوتے دکھائی ہیں۔ نکلتے ہیں۔

”زندگی انھی نئے نئے تجربات کا کتب نظر آتی تھی۔“
 ”زندگی کے تجربے نے انھیں سکھایا کہ اصولوں کی بہ نسبت انسان زیادہ قابلِ عزت ہے۔“

صاف ظاہر ہے کہ پریم چند کے پرانے تصورات ٹوٹ رہے تھے، انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ سماج کے اصول کوئی ازل سے بندھے ہوئے اصول نہیں سماج کے اقتصادی ڈھانچے کے ساتھ وہ بھی بننے بگڑتے رہتے ہیں۔ جن دنوں انھوں نے یہ ناول لکھا انھیں دنوں انھوں نے ایک کہانی ”قربانی“ لکھی تھی جو ۱۹۱۹ء میں زمانہ ”میں چھپی تھی۔ کہانی کا آغاز یوں ہوتا ہے :-

”اُن کی حیثیت کا زیادہ اثر غالباً اس کے نام پر پڑتا ہی۔ منگرو دھاکر جب سے کانسیٹل ہو گئے ہیں، ان کا نام منگل سنگھ ہو گیا ہے۔ اب انھیں کوئی منگرو کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ کلو اہیر نے جب سے تھانہ دار صاحب سے دوستی کی ہے اور گاؤں کا لکھیا ہو گیا ہے اس کا نام کالکا دین ہو گیا ہے۔ اس طرح ہر کچھ چند کو ری اب ہر کھو ہو گیا۔“

ہر کھو کی دولت اور کھیت ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ یہ سماج کے خصوصاً درمیانہ طبقے کے بننے بگڑنے کی صحیح تصویر ہے۔ پریم چند کیسے بوسیدہ اصولوں پر کاربند رہتے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے اتنی بڑی جنگ

لڑائی گئی تھی، دس میں انقلاب آگیا تھا۔ دنیا کے ایک وسیع خطے کو لوٹ کھسوٹ کے نظام سے نجات ملی تھی۔

پریم چند جو قدم قدم پر حالات کا جائزہ لیتے رہتے تھے روس کے اکتوبر انقلاب سے متاثر ہوئے کیونکہ ”پریم آشرم“ کا بلراج جو اجا وغیرہ پڑھنے کا عادی ہے۔ وہ سرکاری ملازموں کے مقابلے میں گاؤں والوں کی حمایت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہم کیوں کسی کی دھونس سہیں۔ دس میں کسانوں، مزدوروں نے اپنا راج قائم کر لیا ہے۔

اس قسم کا انقلاب پریم چند اپنے ہاں چاہتے تھے۔ اس نادل کے اخیر میں اٹھوں نے گاؤں کی جودل کش تصویر کھینچی ہے وہ یقیناً انقلاب کے بعد کا نقشہ ہے۔ پریم چند کا حسین خواب ہے۔

لیکن پریم چند عمل آدمی تھے وہ جو خواب دیکھتے تھے اُسے پورا کرنے کے لئے جدوجہد کرتے تھے۔ چنانچہ وہ اصلاح پسندی چھوڑ کر انقلاب کے داعی بن گئے انقلابی اگر بنے نہیں تھے تو بن ضرور رہے تھے۔ انہوں نے خود اپنا ہی تجزیہ کرنے کے بعد یہ بات لکھی ہے کہ ”ستیاگرہ میں تشدد کو مغلوب کرنے کی طاقت ہوتی ہے، یہ خیال غلط ثابت ہوا۔“

کسانوں پر جو ظلم ہو رہا تھا اس کا علاج ستیاگرہ نہیں تھا اور ایک مندر کے ایک غوث خاں کو قتل کر دینے سے بھی کچھ نہیں بنتا تھا۔ اس کے لئے ایک مجموعی جدوجہد کی ضرورت تھی۔ اور جب اس جدوجہد کا وقت آیا تو پریم چند نے جھٹ ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور وہ عملی طور پر

جدوجہد میں شریک ہو گئے۔

منشی دیا نارائن نگم لکھتے ہیں کہ انھوں نے استغفے فروری ۱۹۲۲ء میں دیا۔ لیکن پریم چند خود اپنے مضمون میں استغفے کا ذکر یوں کرتے ہیں

..... یہ ۱۹۲۲ء کا واقعہ ہے۔ ان دنوں تحریک عدم اشتراک عمل زوروں پر تھی۔ جلیان والہ باغ کا واقعہ ہو چکا تھا۔ انھی دنوں جہاتا گاندھی نے گورکھ پور کا دورہ کیا۔ غازی میاں کے میدان میں اونچا پلیٹ فارم تیار کیا گیا۔ دو لاکھ سے کم کا مجمع نہ تھا۔ تمام ضلع کی عقیدت مند سپلک دوڑی آئی تھی۔ ابا مجمع اس سے پہلے میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہ دیکھا دیکھا تھا۔ جہاتاجی کے درشنوں کی یہ برکت تھی کہ میرے ایسے مردہ دل آدمی کے دل میں بھی جان آگئی۔ اس کے دو ہی چار دن کے بعد میں نے اپنی بیس سال کی سرکاری ملازمت سے استغفے دے دیا۔

سماجی اور سیاسی شعور رکھنے پر بھی استغفے دینے کا کام اتنی آسانی سے نہیں ہو جاتا۔ بیس سال کی ملازمت کو ایک دم ٹھکرا دینا بہت بڑی بات ہے۔ پریم چند کے دل میں عرصے سے مواد پک رہا تھا ”سوز وطن“ کی کاپیاں جلائی گئیں۔ اُن کے قلم پر تعزیریں بٹھائی گئیں، جس سے انہیں یقین ہو گیا کہ اس نظام حکومت میں ادب آزاد نہیں ہے۔ اسے آزاد کرانے کے لئے تبدیلی کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ملازم ہوتے ہوئے بھی انگریزوں کو کبھی پسند نہیں کرتے تھے ایک مرتبہ منشی دیا نارائن نگم نے اپنی لڑکی کی شادی کے موقع پر دعوت میں دیگر احباب کے ساتھ

چند انگریز حکام کو بھی مدعو کیا تھا۔ پریم چند کو یہ بات بُری لگی، اور انہوں نے ایک خط میں صاف لکھا کہ ”آپ نے انگریزوں کو ناحق مدعو کیا وہ اُسے دوستی نہیں حکمران طبقے کی خوشامد سمجھتے ہیں“ اور خوشامد کو نہیں جڑھ تھی۔ ملازمت کا انحصار ہی خوشامد پر تھا، اس لئے پریم چند کو ملازمت سولی نفرت تھی۔ دیانند ٹنم کے نام بستی سے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

”میں جو عاجز ہوں وہ مانجھی سے کام ایسا کرنا چاہتا ہوں جس میں بجز میری طبیعت کے اور کسی کا تقاضا نہ ہو۔ جی میں آوے تو رات دن کام کرتا رہوں اور جی چاہے تو فوراً کروں۔ مگر یہ صرف مالکانہ حیثیت سے ہو سکتا ہے“

مواد پکارتا رہا، اور شعور کی پختگی کے ساتھ ذاتی نفرت اجتماعی جذبہ کے جذبے میں منتقل ہوتی رہی اور آخر اس نفرت نے استغفیٰ کی صورت اختیار کر لی۔ استغفیٰ کے الفاظ نہ جلنے کیلئے تھے، لیکن ان کی کہنا ”لال فیتہ“ کے ہیرو ہر ہی بلاس نے بھی سرکاری ملازمت سے استغفیٰ دے دیا تھا۔ اس کے الفاظ ملاحظہ ہوں :-

”جناب من ! میرا عقیدہ ہے کہ نظام سلطنت مشیت ایزدی کی ظاہری صورت ہے، اور اس کے قوانین بھی رحم حق اور انصاف پر قائم ہیں۔ میں نے پندرہ سال تک سرکار کی خدمت کی اور حتی الامکان اپنے فرائض کو دیانت داری سے سرانجام دیا۔ لیکن ہے کہ بعض موقعوں پر حکام مجھ سے خوش نہ رہے ہوں، کیونکہ میں نے شخصی احکام کی اطاعت کو

کبھی اپنا فرض نہیں سمجھا۔ جب کبھی میرے احساسِ قانون اور حکمِ حاکم میں تناقص ہوا۔ میں نے قانون کی پیروی کی۔ میں ہمیشہ سرکاری ملازمت کو خدمتِ ملک کا بہترین ذریعہ سمجھتا رہا لیکن مراسلہ نمبر..... موضوع

..... میں جو احکام نافذ کئے ہیں۔ وہ میرے ضمیر اور اصول کے مخالف ہیں اور میرے خیال میں ان میں ناحق پیروی کا اتنا دخل ہو کہ میں اپنے تعلیماتِ تعمیل کے لئے کسی حالت میں آمادہ نہیں کر سکتا۔ وہ احکام رعایا کی آزادی میں مداخلت اور ان کی سیاسی بیداری کے قائل ہیں۔ ان حالات پر نظر کر کے میرا اس نظامِ حکومت سے تعلق رکھنا ملک اور قوم کی رنج گنی کرنا ہے۔ دیگر حقوق کے ساتھ رعایا کو سیاسی جادو جہد کا بھی حق حاصل ہے، اور چونکہ گورنمنٹ اس حق کو پامال کرنے کی دہ پلے ہے۔ لہذا میں سہارستانی ہونے کے اعتبار سے یہ خدمت انجام دینے سے معذور ہوں اور استدعا کرتا ہوں کہ مجھے بلا مزید تاخیر اس عہد سے سبک دینا کیا جائے۔“

یہ کہانی جولائی ۱۹۲۱ء میں ”زمانہ“ میں شائع ہوئی تھی۔ لہذا یہ تھوڑے سے وقت و بدل کے ساتھ پریم چند کے اپنے استعفیٰ کے الفاظ ہیں۔

پریم چند سر دل عزیز ماسٹر تھے۔ استعفیٰ کے بعد اسکول چھوڑنے کا منظر ”تحریک“ کہانی میں یوں پیش کیا ہے۔۔۔
 لڑکے مجھ سے مانوس ہو گئے تھے۔ ان کی طرف سے مجھے خیر

گھر میں

"گھر" کتنی ہی مقدس، ملائم اور خوش
گوار یادوں کو بیدار کر دیتا ہے۔ گھر محبت
کی آماجگاہ ہے۔ محبت نے بہت حسرت
کے بعد یہ بردان پایا ہے "دیریم چند"

گھر اتنا مانوس لفظ ہے کہ اس کے بارے میں کچھ سیچنے اور اس کی تعریف
یا تشریح دھونڈنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن جب سے پریم چند
کی ماں مر گئی تھی تب سے گھر ان کے لئے گھر نہیں رہ گیا تھا۔ اس لئے انھوں
نے گھر کی بابت بہت کچھ سوچا تھا۔ گھر سے وابستہ امنگوں اور حسرتوں
کی انھوں نے اپنی کہانیوں اور ناولوں میں بارہا ترجمانی کی ہے۔ میدان عمل

میں گھر کی تشریح یوں کرتے ہیں کہ جہاں اپنے خیالات کی حکومت ہو وہی اپنا گھر ہے۔ جو خیالات سے موافق ہوں وہ اپنے گئے ہیں۔
 بچکے کے بھی خیالات ہوتے ہیں۔ ماں ان سے ہمدردی رکھتی ہے۔ ان میں دلچسپی لیتی ہے اور اُس کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ یہی اس کی محبت اور مانتا ہے۔ سوتیلی ماں میں یہ مانتا نہیں تھی اس لئے پریم چند نے کہا کہ: ”ماں تو اپنی ہو، سولہ آنے اپنی“ کوئی دوسری عورت اس کی جگہ نہیں لے سکتی۔

سوتیلی ماں کو پریم چند سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ ان پر اور ان کی بیوی پر حکومت کرتی تھی اور ایک دوسرے کی چغلیاں کر کے انہیں آپس میں لڑاتی بھی رہتی تھی۔ دوسرا بیاہ ہو جانے کے بعد پہلی بیوی کا ذکر کرتے ہوئے پریم چند نے شورانی دیوی سے کہا تھا کہ اگر ”چاچی نہ ہوتی تو شاید ہم دونوں کی آپس میں نبھ جاتی۔“
 چاچی ہی کی بدولت آٹھ سال تک پریم چند کی شورانی دیوی سے بھی نہیں بنی، اس گھر میں ان کی کوئی قدر نہیں ہوتی، کاستھ برادری کے رواج کے مطابق وہ چاچی سے پردہ کرتی تھیں اور بکر رہتی تھیں جب چاچی کے رہتے پریم چند ہی اس گھر کو اپنا گھر نہ سمجھتے تھے تو شورانی دیوی کیسے سمجھتیں؟ انہیں یہ گھر کاٹنے کو آتا تھا۔ پریم چند تو پھر بھی آدمی تھے کافی عرصہ گھر سے باہر رہتے تھے، دوستوں سے ہنس کھیل سکتے تھے، جی بہلا سکتے تھے۔ پردہ دار عورت کے لئے گھر ہی سب کچھ تھا اور اُسے

یہاں کڑھنا پڑتا تھا، اس لئے وہ سال میں دس مہینے باپ کے گھر اور صرف دو مہینے شوہر کے گھر رہتی تھیں۔ شورانی دیوی کی ماں بھی بچپن ہی میں مر گئی تھی، گھر پر باپ تھا اور ایک چھوٹا بھائی تھا جسے انھوں نے ماں کی طرح پالا تھا، گھر میں انھیں کس راج تھا۔ اس لئے وہاں خوب گذرتی تھی، لیکن یہ بات پریم چند کو پسند نہیں تھی۔ دوسرا بیٹا اسی لئے کیا تھا کہ اپنا گھر بنے گا۔ لیکن بیوی لا کر بھی آٹھ سال بے گھر کے گزر گئے، بیوی بیوی دونوں ہی چاچی کے دست نگر تھے جس کے سلوک میں چنداں فرق نہیں آیا تھا۔ کمانے والے پریم چند تھے لیکن چاچی کے لئے بیٹا اور بھائی ہی اپنے تھے پریم چند غیر تھے۔ اگر اپنے تھے تو صرف اتنے ہی کہ وہ کما کر دیتے تھے۔

یہ بات شورانی دیوی کو بھی پسند نہیں تھی۔ لیکن جب کمانے والا خیر دلچھ نہیں بولتا، اپنے گھر میں بیگانہ ہو کر رہتا تو وہ بولنے والی کون ہوتی ہیں۔ جب بلاوا آتا تھا چچے سے باپ کے گھر چلی جاتی تھیں لیکن ایک مرتبہ جب باپ نے انھیں بلایا تو پریم چند نے خلاف معمول بھجنے سے انکار کر دیا۔ اس پر شورانی دیوی بہت جھللائی اور دونوں اچھا خاصا جھگڑا ہو گیا۔ پریم چند بھی جھلٹائے اور شورانی کو دو چپٹ لگا کر باہر چلے گئے، شام کو لوٹے تو منہ لگے۔

”اس طرح کیوں جھللاتی ہو“

”میں جھلاؤں کیوں؟“

”کیسے کہوں کہ تم جھلائی نہیں ہو؟ نہ کسی سے بولنا نہ کسی سے کچھ کہنا سننا“
 سنساری دینے کے لئے تو آپ نے مجھے اپنے گھر جانے نہیں دیا۔ قیدی
 کیسے سکھی رہ سکتا ہے“

”یہ تمھاری بھول ہے۔ میں نے تمھیں تکلیف دینے کی نیت سے
 نہیں بلکہ میں تمھیں جانے دینا نہیں چاہتا۔ سچ کہتا ہوں تم گھر چلی جاتی ہو
 تو مجھے اچھا معلوم نہیں ہوتا، میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے گھر میں آرام سے
 رہو۔ آخر یہ گھر تمھارا کیوں نہ بنے؟“

”مجھے کیا پڑی ہے کہ دوسرے کے گھر میں گھر والی بنوں“
 ”تو گھر کیسے چلے گا، میری سمجھ میں نہیں آتا“

”جیسا چل رہا ہے، ٹھیک ہے۔ میں اس بلا کو باننا نہیں چاہتی۔ پھر
 آپ کو تو کافی پیار کرتی ہیں۔ میری بات چھوڑئے۔ میں بھی جس حالت میں
 ہوں، اس حالت میں رہ لوں گی۔ میں بھی مست جیو ہوں۔“

”ہاں اسی میں مست رہتی ہو کہ آندے سے جا کر بیٹھتی ہو، جس کو تم
 پیار سمجھتی ہو وہ پیار نہیں ہے۔ ماں کی محبت بے غرض ہوتی ہے۔ جب
 دہری مجھے نصیب نہ ہوئی تو اس کے پیچھے میں کہاں تک پڑوں؟“

تبا لفاظ کہتے کہتے اُن کی آنکھوں میں آنسو اُڑائے اس روز مجھے
 ان پر دیا آنے لگی، اسی دن سے میں ان میں ملنا چاہنے لگی۔ (پریم چند گھر میں)
 اب گھر میاں دیوی کے مشورہ سے چلنے لگا۔ شوالی دیوی نے خاوند
 کی بات مان لی اور جاچی سے پردا اٹھا کر مالکن بننے لگیں، اور انھوں نے

تھوڑے دنوں میں نہ صرف اپنے لئے بلکہ پریم چند کے لئے بھی اس گھر میں جگہ بنادی۔ چاچی کی بی بی اور جوڑ توڑ اس کے بعد بھی جاری رہی لیکن شہزادی دیوی کے سامنے اُن کی ایک نہ جلتی تھی۔ بیوی کی اس جرات کا اعتراف کرتے ہوئے پریم چند نے کہا کہ ”اگر پہلے سے تمہارے ساتھ میری شادی ہوتی تو میری زندگی اس سے آگے ہوتی۔“

پریم چند کی زندگی کو اُسے بڑھانے میں شہزادی دیوی کا واقعی بہت ہاتھ رہا ہے، جب کبھی بھی اُنھوں نے کوئی فیصلہ کن قدم اٹھانے کا ارادہ کیا تو شہزادی دیوی نے ان کی ہمت بڑھائی۔ استغنیٰ دینے سے پہلے وہ کئی روز تک سوچتے رہے تھے۔ اُنھیں دور واز تک نیند نہیں آتی تھی۔ بچے ہیں، بیوی ہے، خود بیمار رہتے ہیں، گذارہ کیسے چلے گا؟ اس وقت آخری فیصلہ شہزادی دیوی نے کیا تھا ”تم گذارے کی فکر نہ کرو۔ وہ چلتا ہی رہتا ہے۔ اگر دیس قربانی کا تقاضا کرتا ہے تو اُسے دینے میں دریغ نہیں کرنا چاہیے۔“

ایک دفعہ الور کے راجا نے اپنے پانچ چھ آدمی ایک چٹھی دے کر پریم چند کے پاس بھیجے۔ راجہ صاحب کہا نیوں اور نادولوں کے شریفین تھے اُنھوں نے پریم چند کو اپنے پاس رہنے کے لئے بلایا تھا اور لکھا تھا کہ چار سو روپے ماہوار تنخواہ منگلو اور موٹر ملے گی۔ اُنھوں نے راجا کو نو لکھ بھیجا کہ مجھے معاف رکھئے۔ اتنا ہی غنیمت ہے کہ آپ میری کہانیاں اور ناول پڑھ لیتے ہیں۔ لیکن گھر جا کر شہزادی دیوی سے جھوٹے موٹر مشین

کرنے لگے اور بولے :- ”میری خواہش ہے کہ چلوں ، کچھ دن بنگلے موٹر کا شوق تو پورا کر لوں ، میری کمائی میں اس کی گنجائش نہیں ۔“

شورانی دیوی نے چٹ جواب دیا :- ”یہ اسی طرح ہوا جس طرح کوئی بیوا ، اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے رچکے میں بیٹھے پھر جس نے مزدوری کرنا اپنا مقصد بنا لیا ہو ، اس کے لئے موٹر بنگلے کی خواہش کیسی !“

پریم چند کی ”تحریک“ کہانی کا ہیرو کہتا ہے :- ”ماں کے فیض اور اثر سے بڑے بڑے انسان سرسبز ہوئے ہیں ۔ میں جو کچھ ہوا دیوی کے فیض اور اثر سے ہوا ۔ وہ میری تقدیر کا معیار تھی ، کتنی بلند حوصلہ تھی ، کتنی اہنی ہمت ! کتنا ملکہ تھی ایثار !“

آدمی کو ماحول اور حالات بناتے ہیں اور اس میں شخصیتوں کا بھی بڑا ہاتھ ہوتا ہے ۔ پتہ چلتا ہے کہ پریم چند اور شورانی دیوی نے ایک دوسرے کے ارتقا میں بے حد اضافہ کیا ۔ شورانی دیوی کی جب شادی ہوئی تو وہ معمولی ہندی — بالکل نہیں کے برابر ، جانتی تھیں ۔ پریم چند کی صحبت میں پڑھنے لکھنے اور مطالعے کا شوق بڑھا اور وہ خود بھی کہانیاں لکھنے لگیں ۔ پریم چند جب کوئی اخبار یا کتاب پڑھتے تھے تو انگریزی سے ترجمہ کر کے انھیں سنایا کرتے تھے اور ان کے ساتھ سماجی اور سیاسی مسئلوں پر گفتگوں بحث کیا کرتے تھے ، جو دیگ عورتوں کو محض مورکھ سمجھتے ہیں اور ان پر اپنی برتری جاتے ہیں اور اپنے اس رویے سے گھر کو تو توڑیں جس میں ”کا

اکھاڑہ بنا لیتے ہیں، پریم چند نے اپنی کہانی ”کھڑ“ میں ایسے آدمیوں کی خوب کھلی اڑائی ہے۔

اُن کے تین بچے ہیں۔ ایک لڑکی اور دو لڑکے۔ لڑکی کا نام مکلا ہے وہ ہوبو میں پیدا ہوئی تھی اور اگست ۱۹۱۹ء میں جب وہ بستی سے تبدیل ہو کر گورکھ پور گئے تو اس روز ان کا بڑا لڑکا شری پت رائے دھنوا پیدا ہوا۔ وہیں ایک لڑکا منو نامی پیدا ہوا تھا جو جولائی ۱۹۲۰ء میں مر گیا۔ پریم چند کو اس بچے کے گذر جانے کا بڑا رنج ہوا، لیکن بی بی پر طاہر نہیں بنے دیا۔ وہ خدا انھیں نسی دیتے رہے۔ اس کے بعد اگست ۱۹۲۲ء میں ان کا چھوٹا لڑکا امرت رائے (بنو) پیدا ہوا۔

وہ اپنے بچوں سے بے حد پیار کرتے تھے اور دونوں لڑکوں کو دھنوا اور بنو کہہ کر پکارتے تھے۔ دفتر سے لوٹ کر گھنٹہ بھر بچوں کے ساتھ کھیلتے تھے، کہتے تھے کہ اس سے تھکن دور ہوتی ہے۔ روح میں بازی آجاتی ہے۔ پھر کام پر بیٹھ جاتے تھے۔ جب گناؤں میں تھے تو شام کو دوڑنے کے باہر بچوں کے ساتھ کھیلا کرتے تھے اور خدا انھیں طرح طرح کے کھیل سکھاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی کہانیوں میں بچوں کا ذکر نہایت ہی محبت اور شفقت سے کیا ہے، ”بھوت“ کہانی میں لکھتے ہیں:

”جو بے جی کے عیش و آرام میں صرف ایک بات کی کمی تھی۔ اُن کے کوئی لڑکی نہ تھی۔ پہلی لڑکی کے بعد پھر لڑکی ہوئی ہی نہیں اور نہ اب ہونے کی امید تھی۔ عورت اور مرد دونوں اس کو یاد کر کے رونا کرتے تھے۔ لڑکیاں

بچپن میں لڑکوں سے زیادہ چرخیلے کرتی ہیں۔ ان چرخیلوں کے لئے دونو جسے بے چین رہتے۔ ماں سوچتی، لڑکی ہوتی تو اس کے لئے کہنے بنوائی، اس کے بال گونٹھنی۔ لڑکی پیرنیاں پہنے ٹھک ٹھک انگن میں چلتی، تو کتنا فراتا۔ آخر یہ اروز راتنی شدید ہوئی کہ منگھلا نے اپنی چھوٹی بہن کو بلا کر بیٹی کی طرح پالنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے ماں باپ غریب تھے راضی ہو گئے۔ یہ لڑکی منگھلا کی سوتیلی ماں کی بیٹی تھی۔ بڑی خوب صورت اور بڑی خچل۔ نام تھا بنی۔ چوبے جی کا گھر اس کے اُن سے کھل اُٹھا۔ دو چار ہی دن میں لڑکی اپنے ماں باپ کو بھول گئی۔ اس کی عمر تو چار برس کی تھی۔ لیکن اسے کھیلنے کے بجائے کچھ کام کرنا اچھا لگتا تھا۔ منگھلا رسوئی بنانے جاتی تو بنی بھی اس کے پیچھے جاتی۔ اس سے آگاہ نہ ہونے کے لئے جھگڑا کرتی۔ ترکاری کا بی اُسے بڑا فراتا تھا۔ جب تک وکیل صاحب گھر پر رہتے۔ تب تک وہ ان کے ساتھ دیوان خانے میں بیٹھی رہتی، کبھی کتابیں الٹتی، کبھی دوات قلم سے کھیلتی۔ چوبے جی مسکرا کر کہتے۔ بیٹی مار کھاؤ گی؟ بنی کہتی۔ تم مار کھاؤ گے۔ میں تمہارے کان کاٹ لوں گی۔ جو جو بلا کر پچڑ دوں گی۔ اس پر دیوان خانے میں خوب تھپتھپ اُڑتے۔۔۔۔۔۔

”مستعار گھڑی“ کا ہیردجیب اپنے دوست دانو سے گھڑی مانگنے جاتا ہے تو وہ انھیں خوش کرنے کے لئے اُن کے چھوٹے بچے کو جو سامنے صحن میں کھیل رہا تھا، گود میں اُٹھا کر لگا بھینچ بھینچ کر پیار کرنے۔ دانو بولنے ”اجی کھیلنے دو پا جی کو۔ سوار ہے، تمہارا کرتا میلہ ملا جاتا ہے میں

تو اُسے چھوٹا بھی نہیں۔“

میں نے بزرگانہ انداز سے کہا ”میرا کرتا میلا ہو رہا ہے تو اس کی تھیں کیا فکر ہے، اب پھول سا بچہ اور اس کی یہ قدر! تم جیوں کو ایشور ناتھ بچے دیتا ہے بھنیں بھاری معلوم ہوتا ہے تو لاؤ مجھے دے دو۔“

یوں ملائت کر کے میں نے بچے کو کندھے پر بٹھالیا اور کوئی پندرہ منٹ صحن میں اچکتا پھرا۔ بچہ کھل کھلاتا تھا اور مجھے دم نہ لینے دیتا تھا۔ معلوم نہیں اس سواری کا پہلے بھی کبھی لطف حاصل ہوا تھا یا نہیں۔ مگر تھادہ بے حد خوش۔“

ان کی محبت بچوں سے کھینچنے کھلانے تک محدود نہیں تھی۔ وہ ماں زیادہ بچوں کی غور پر درش کرتے تھے۔ بیوی کے جب دوسرا بچہ ہوا تو وہ پہلے بچے کو اپنے ساتھ لے کر سوتے تھے اور جب شعورانی دیوی تیسرے بچے کی ماں بن گئی تو پریم چند دس بچوں کو اپنے ساتھ سلاتے تھے۔ بچے سوتے میں پیشاب کر سی دیتے تھے وہ رات کو دو مرتبہ اٹھ کر ان کا بچھاؤں کرتے تھے۔ اپنے بھگے ہوئے کپڑے تبدیل کرتے تھے اور سو جاتے تھے۔

گھر میں بیماریاں لگی ہی رہتی ہیں۔ پریم چند خود پیٹ کے روگ کی وجہ سے اکثر بیمار رہتے تھے۔ لیکن انھیں اپنی بہ نسبت گھر کے دوسرے لوگوں کی فکر زیادہ رہتی تھی، کوئی بچہ بیمار پڑ جاتا تھا تو اُسے ساری ساری رات کندھے سے ٹٹکائے گھومتے رہتے تھے۔ اس خیال سے کہ زیادہ محنت

کرنے سے شورانی دیوی کہیں بیمار نہ ہو جائیں۔ وہ ہر ایک کام میں ان کا ہاتھ بٹاتے تھے، اور جب کبھی وہ بیمار پڑ جاتی تھیں تو سارا کام خود کرتے تھے روٹی تک اپنے ہاتھ سے بناتے تھے، برتن مانتے تھے۔ جب ماسٹر تھے تو گھر میں اکثر نوکر بھی رہتا تھا لیکن وہ اپنا کئی بھی ذاتی کام اس سے نہیں کرواتے تھے۔ اسے ڈائمنڈ ڈیپٹے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بیوی سے کہا کرتے تھے کہ نوکر بھی گھر کا ایک فرد ہی ہے۔ ایک مرتبہ ایک نوکر نے انھیں ایسا دھوکا دیا کہ ایک ہزار روپیہ نقد اور ڈیڑھ ہزار روپے کے زیور نکال کر لے گیا۔ انھوں نے تھانے میں رپٹ تک نہیں لکھوائی بیوی سے کہہ دیا "اسے ضرورت تھی، لے گیا۔ لے جانے دو۔ ہمارا کام بھی چلتا ہی رہے گا۔"

چونکہ چاچی کا سبھاؤ تلخ تھا۔ بہن کی چاچی سے بالکل نہیں ملتی تھی اس لیے سب سے وہ بیابانی گئی تھی پریم چند نے اسے اپنے گھر نہیں بلایا۔ شورانی دیوی نے کئی مرتبہ بلانے کے لئے اصرار بھی کیا۔ بلانے کی حسرت ان کے اپنے دل میں بھی تھی لیکن چاچی کے خیال سے چپ رہتے تھے جلتے تھے کہ بہن کے اپنا گھر تو ہے کسی نہ کسی طرح وہاں رہ لے گی اُسے معلوم ہی تو ہے کہ ماں نہیں ہے اور بھائی کا زور نہیں چلتا مگر بلائیں گے تو چاچی کو تکلیف ہوگی۔ اگر وہ تکلیف سے بچ کر جانا چاہے تو کہاں جئے گی؟ اس کا دوسرا کون ہے۔ یہ سوچ کر اپنی طبیعت پر جبر کر لیتے تھے۔

لیکن جب چاچی کا بیٹا برس برس بزرگوار ہو گیا اور وہ اس کے ساتھ الگ رہنے لگی تو انھوں نے بہن کو بلا کر اپنے دل کی حسرت پوری کی لیکن اس کے بعد زیادہ دنوں زندہ نہیں رہی، اس کی تین بیٹیاں تھیں۔ پریم چند جو سلوک بہن سے نہ کر سکے تھے وہ اُن سے کرتے رہے۔ انھیں اکثر اپنے گھر بلایا کرتے تھے۔

پریم چند کو گانے کا بھی شوق تھا۔ شہرانی دیوی کہتی ہیں کہ جب میں بیاسی اُمی لکھی تو مجھے گانا نہیں آتا تھا۔ میں نے اُن سے گانا سیکھا، مولیٰ، دیوالی کوئی تہوار آتا تو بچوں کو ساتھ لے کر خوب ٹھاٹھ سے مناتے تھے ایسے موقعوں پر میاں بیوی دونوں مل کر گایا کرتے تھے، اور سب کو اُن کے دل پسند تحفے خرید کر دیا کرتے تھے۔

چھوٹے بڑے، بچے، بوڑھے انھیں ہر ایک کا خیال رہتا تھا جو اپنے تھے انھیں ہمیشہ اپنے بنا کر رکھا۔ چاچی کا سبھاؤ ساری عمر نہیں بدلا لیکن وہ جی جان سے اُن کی اور ان کے بیٹے کی پرورش کرتے رہے۔ چاہتے دن چائے انھیں باپ کی صرح مانتے رہے۔ چچیرا بھائی پرانے ڈھب کے آدمی تھے شہرانی دیوی تک کو ڈانٹ دیتے تھے۔ پریم چند کو یہ پسند نہیں تھا کہ کوئی آدمی عورتوں کو ڈانٹے لیکن بھائی کی عادت کو سمجھتے ہوئے خاموش رہتے تھے۔ یہ حسنِ سلوک اور رواداری اُن کے افسانوں اور ناولوں کی جان ہے۔ وہ جانتے تھے کہ جو عادتیں پک چکی ہیں انھیں بدلنے کی کوشش کرنا بے کار ہے۔ وہ بزرگوں کے بے ضرر توہمات اور جہالت کو بھی برداشت

کر لیتے تھے۔

لیکن بچوں کی بے راہ روی انھیں ذرا بھی پسند نہیں تھی۔ اپنے بچوں کی معمولی معمولی حرکتوں کا خیال رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ دھنوا اور بنو گھر سے بدام ہو کر الہ آباد جا رہے تھے۔ وہ دونوں کالج میں پڑھتے تھے۔ بنو نے تو بڑے ادب کے ساتھ ماں باپ کو پرنام کیا لیکن دھنوا ویسے ہی چل پڑا پریم چند کو اس کا یہ رویہ اچھا نہیں لگا۔ مگر شورانی نے کہا کوئی بات نہیں بچہ ہے بڑا ہو کر خود سدھر جائے گا۔ اس سے پریم چند کی تسلی نہیں ہوئی انھوں نے بڑے دکھ سے پیشگی کی کی۔ "اس لڑکے کے ڈھنگ کچھ اچھے نہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ خود غرض اور مغرور بنے گا۔"

اس کے برعکس دوسرا واقعہ ہے۔ ایک مرتبہ ان کی کہارمی کا بچہ آگ سے جل گیا تھا۔ اس کے سارے جسم پر مرہم کا لیمپ تھا، اور کپڑے بھی گندے تھے۔ چھوٹے لڑکے بنو نے اُسے کہیں باہر کھڑے دیکھ لیا۔ وہ اُسے اُٹھا کر ادپر لایا اور ماں سے کہا کہ اُسے کچھ کھانے کو دو۔ پریم چند اس بات سے بہت خوش ہوئے اور بولے۔ "یہ لڑکا بہت رحمدل معلوم ہوتا ہے۔ اس بچے کو تو میں بھی نہ لاسکتا۔ تم دیکھنا، تمہارا نام یہ روشن کرے گا۔"

وہ خود اپنے بچوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ میوٹر رکھنا انھیں پسند نہیں تھا کیونکہ جو کچھ وہ خود پڑھا سکتے تھے، میوٹر کہاں پڑھا سکتا تھا صرف کتابیں پڑھا دینا تو مقصود نہیں تھا۔ وہ انھیں آدمی بنانا چاہتے

چاہتے تھے۔ اس لئے دو تین گھنٹہ ہر روز انھیں پڑھانے میں صرف کرتے تھے پڑھاتے ضرور تھے لیکن بچوں کو ڈانٹنا ڈیڑھ پچھنا اور ناسمج بننا انھیں قطعاً گوارا نہیں تھا "شکوہ و شکایت" کہانی بیوی کی زبانی بیان کی گئی ہے۔ خاندان کا کردار بہت ہی لطیف اور دل کش ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شورانی دیوی نے خود پریم چند کی کہانی بیان کی ہے۔ اس میں بچوں کے متعلق خاندان کے رویہ کا ذکر لیں آتا ہے :-

"آپ نے ایک نئی اچھی نکالی ہے کہ لڑکے تادیب سے خراب ہو جاتے ہیں اس کا نتیجہ ہے کہ لڑکے شربے پھاڑ دیتے ہیں..... کبھی لگی دڈا ہے۔ کبھی گولیال۔ حضرت بھی انھیں کے ساتھ کھیلتے ہیں"

جب نو لڑکے الہ آباد میں پڑھتے تھے تو انھیں یہ فکر رہتی تھی کہ کہیں دھنوا بنو سو حکومت نہ کرنا ہو۔ شورانی کہتے، کیا برا ہے؟ وہ اس کا بڑا بھائی بھی تو ہے۔ لیکن پریم چند جواب دیتے، تم نہیں جانتیں اس سے بچوں میں احساس کسری پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اپنے باپ پر کڑھتے رہتے ہیں، محبت کی حکومت تو کچھ بری نہیں، لیکن کالج میں جاتے ہی لڑکے خود سر ہو جاتے ہیں۔ میں انھیں آزاد رکھنا چاہتا ہوں۔"

اس لئے وہ دونوں لڑکوں کو الگ الگ خط لکھتے تھے اور بیوی کو بھی دو دو کو الگ الگ لکھنے کی ہدایت کر رکھی تھی۔

شورانی کہتے :- تو کیا اس سے حکومت کا رجحان کچھ رک جائے گا، پریم چند :- کیوں نہیں رُکے گا وہ اسے تکلیف دے گا تو وہ مجھے لکھے

۴۔ میں پوچھوں گا۔

شورانی بہ بہت سے پتا تو اپنی ذمہ داری چھوڑ بیٹھے ہیں۔
پریم چند۔ وہ نالائق ہیں۔ لائق پتاکب اپنی ذمہ داری دوسروں پر ڈالے
گیا۔ اگر اس میں ذمہ داری اٹھانے کی طاقت نہ ہو تو کسی کو دنیا میں
لانے کی کیا ضرورت ہے؟

شورانی :- دنیا میں آدمیوں کا اناکب رکنا ہے ؟
" تو پھر ایسے نالائقوں کی دنیا میں کمی بھی نہیں۔ سب کچھ انسان کرتا
ہے عزت کے لئے۔ جب اپنے ہی گھر میں عزت نہ ہوئی تو کیا؟ مجھے ایسے باپ
سے کوئی ہمدردی نہیں جو اپنی ذمہ داری دوسروں پر ڈالتے ہیں۔"
اس کے علاوہ اور کتنی ذمہ داریاں تھیں، اسکول میں نوکری کرتے
تھے امتحان دینے کے لئے پڑھتے تھے۔ لکھنے کے لئے مطالعہ وسیع کرتے تھے
پھر کہانیاں انا دل اور مضامین لکھتے تھے۔ اپنی اس مصروفیت کا ذکر
انہوں نے اپنی ادیب کا فرض "کہانی میں کیا ہے۔ اور شورانی دیو می بھا
ہیں مری کچھ بتاتی ہیں جو کچھ اس کہانی میں انہوں نے لکھا ہے۔
وہ صبح پانچ کے قریب اٹھ بیٹھتے تھے، جو کچھ ملتا تھا کھاپی کر لکھنے
بیٹھ جاتے تھے۔ قلم ہتھوڑے کی طرح چلتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ادیب
نہیں فردور سمجھتے تھے اور جی توڑ کر محنت کرتے تھے۔ آرام کرنے کی ہوس
انہیں نہیں تھی۔ نو بجے تک لکھتے رہتے، پھر اٹھ کر تیار ہوتے اور کھانا
کھا کر اسکول چلے جاتے۔ تین یا چار بجے لوٹ کر آتے۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ

بچوں سے جی بہلاتے۔ پھر روزانہ اخبار "لیڈر" پڑھتے، اور شام کو کھانا کھانے کے بعد رات گئے تک پڑھتے رہتے۔

جس روز کسی وجہ سے لکھنا پڑھنا نہیں ہوتا تھا، پریم چند سمجھتے تھے کہ وہ دن ضائع ہوا۔ اس لئے اکثر بیماری کی حالت میں لکھنا پڑھنا ترک نہیں کرتے تھے۔ "ادیب کا فرض" کہانی میں لکھتے ہیں:-

"ادب کا یہ بجا رہی دنیا دانیہا سے بے خبر فکر سخن میں غرق رہتا تھا۔ پھر ہندوستان میں سرسوتی کی بوجا گلشنی کی ناراضی کے مترادف ہے۔ دل تو ایک ہی تھا، دونوں دیویوں کو ایک ساتھ کیونکر خوش کرتے؟ اور فرید لکھتے ہیں:-

"ادبی خدمت اور فرہی میں خدا واسطے کا میر ہے۔ اگر کوئی ادیب موٹا تازہ ہو تو سمجھ لیجئے کہ اس میں سوز نہیں، لوج نہیں، دل نہیں چراغ کا کام جلتا ہے۔ چراغ وہی لبالب بھرا ہوگا جو جلا نہیں"

پیش

رائی! یہ ہندوستان ہے اس میں
 "علم کے سہارے جینا مشکل ہے" (پریم چند)
 مستعفی ہونے کے بعد پریم چند کو روزگار کی فکر ہوئی۔ پہلے پتھارچی
 کی شرکت میں چرخوں کی ایک دوکان کھلوائی جس میں خاطر خواہ کامیابی نہ
 ہوئی، مارچ ۱۹۴۷ء میں وہ بنارس چلے گئے اور حالات سے پریشان
 ہو کر گھروں کا کام شروع کرنا چاہتے تھے۔ اس کے متعلق جیننشی دیانارائن
 سنگھ نے یہ مشورہ دیا کہ ہماری یہ لائن نہیں ہے تو پریم چند نے انھیں جواب
 میں لکھا:-

"آپ فرماتے ہیں بمختاری یہ لائن نہیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں، مگر

چارہ کیا ہے ؟ میں قربانی کو اپنی ذات تک رکھنا چاہتا ہوں ، عیال کو اس چٹکی میں پینا نہیں چاہتا۔ فی الحال روٹیاں ملی جاتی ہیں ، کچھ لٹریچر کا کام کر لیتا ہوں ، یہ قربانی ہے ، خدا اور دنیائے دوں ، قوم اور ذات دونوں کو ساتھ لئے ہوں۔ میں لٹریچر کا کام کو تھوڑی قربانی نہیں سمجھتا۔ جو شخص اپنی فالتو آمدنی کا ایک حصہ کسی مدرسے کے لئے خیرات کر دیتا ہے۔ وہ ہماری قربانی کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا جو اپنے لئے سونا تک حرام کر لیتی ہے آپ نے میرے لئے کوئی ایسی تجویز نہیں نکالی جس میں فکر معاش سے آزاد ہو کر میں زندگی کاٹا۔ میں عرض کر چکا اس سے زیادہ نفس کشی میرے امکان سے باہر ہے۔ اور آپ نے جب کبھی کوئی تجویز کی وہی ہوئی ، آکاشی معاش سے مجھے اطمینان نہیں ہوتا۔ ضرورت کے لئے مستقل صورت چاہئے تکلفات کے لئے آکاشی صورت تو مضائقہ نہیں اجاری زندگی میں کس قدر فلماور بھجٹ ہے ابھی ہمارے یہاں وہ زمانہ نہیں آیا کہ جرنلزم کو CAREER (وجہ معاش) بنایا جاسکے۔“

پریم چند سے بہتر لکھنے والا کوئی دوسرا آدمی نہیں تھا پھر بھی انھیں تصنیفات کی آمدنی نہیں کے برابر ہوتی تھی۔ کہانیاں لوگوں مفت چھاپتے تھے کتابیں پہلے تو بھیت ہی نہ تھیں ، اور اگر چھپ بھی جائیں تو ہزار کتاب کا ایک ایڈیشن کہیں برسوں میں جا کر ختم ہوتا تھا ، اردو کا حال تو بہت ہی بتلا تھا ، اور اب تک ہے ”بازار حسن“ ناول انھوں نے اردو میں لکھا تھا ، شائع پہلے ہندی میں ہوا۔ کلکتہ پستک انجینی نے اس کے پہلے

ایڈیشن کے لئے یکمشت چار سو روپے دئے، پریم چند کو اپنی ادبی زندگی میں اتنی بڑی رقم پہلی بار ملی تھی یہ سلسلہ عرصہ کا واقعہ ہے اس کے بعد اسی پبلنگ ہاؤس نے انھیں "پریم اشرم" کے لئے تین ہزار روپے معاوضہ پیش کئے جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ "سیواسدن" کی اشاعت سے ہندی میں ان کی شہرت بھی بہت ہو چکی تھی۔ اسے ہندی کا بہترین ناول مانا گیا تھا۔ اسی وجہ سے پریم چند ہندی کی طرف مائل ہوئے۔ ۱۹۱۵ء کو بستی سے انھوں نے ایڈیٹر زمانہ کے نام ایک کارڈ لکھا: "زمانہ کے لئے ایک قصہ لکھا ہے۔ اب میں ہندی میں بھی لکھ رہا ہوں" "سر سوتی" کو ایک مضمون دیا۔ "پرثا پ" کے لئے لکھا۔ اس سے زیادہ کام کرنے سے معذور ہوں۔"

۱۹۱۵ء عرہی میں بستی سے پھر ایک خط میں لکھتے ہیں :-
 "پریم پچسپی کے ہندی ترجمے کے لئے کئی جگہ سے اصرار ہو رہے ہیں میں خود ہی اس کام کو ہاتھ میں لوں گا۔ اب ہندی لکھنے کی مشق بھی کر رہا ہوں۔ اردو میں اب گذر نہیں۔ معلوم ہوتا ہے بال مکند گپت مرحوم کی طرح میں بھی ہندی لکھنے میں زندگی صرف کر دوں گا....."

بنارس سے ۳۱ مارچ ۱۹۲۶ء کو ایک کارڈ لکھا ہے :-
 "..... زمانہ کے لئے کچھ نہیں لکھ سکا اس کی معافی چاہتا ہوں"

اردو میں کوئی پرسان حال تو ہے ہی نہیں۔ دو ناولوں کے ترجمے دارالاشاعت
پنجاب کو دئے۔ ابھی کچھ طے نہیں ہوا اور فنی..... صاحب مائے
تقا صوفیوں کے ناک میں دم کئے ہیں۔ حالانکہ ۱۵۰ دے چکا ہوں۔ لیکن
ابھی اتنا ہی اور دینا ہے۔ ان دونوں کتابوں کی اشاعت ہی پر یہ خرچہ
وصول ہو گا۔

گویا انھیں اپنی گرہ سے پیسے خرچ کر کے کتابیں چھپوانا پڑتی
تھیں۔ سیواسدن کی اشاعت کے چھ سات سال بعد "بازار حسن"
اسی دارالاشاعت پنجاب لاہور سے شائع ہوا تھا۔ اس سلسلے میں
پریم چند نے سید امتیاز علی تاج کو جو خط لکھا تھا۔ وہ ذیل میں درج
ہے۔

گورکھ پور

۲۲ اپریل ۱۹۲۰ء

مشفق من تسلیم

نوازش نامہ ملا۔ مشکور ہوں۔ "بازار حسن" آپ شائع کریں۔ شرائط
کے متعلق یہ عرض ہے کہ آپ پہلے ایڈیشن کے لئے مجھے ۲۰ فی صدی
راٹھڑی عطا فرمائیں۔ پہلا ایڈیشن بارہ سو نگوں کا ہو گا۔ غالباً ایک روپیہ
آٹھ آنے قیمت رکھی جائے۔ مجھے ۲۸۰ جلدیں ملیں گی۔ یہ جلدیں خواہ مجھے
جلدوں کی صورت میں دیدیں یا روپے کی صورت میں۔ روپے کی صورت میں
دینے سے وہی کمیشن جو میں دوسرے بک سیلر مثلاً رسالہ زمانہ کو دوں

گا۔ آپ کو وضع کردوں گا۔ اگر آپ اسے پسند نہ فرمائیں تو مجھے جلدیں ہی دے دیں۔ میں کسی طرح بیچ یا بکواؤں گا۔ اگر ان دونوں صورتوں میں سے کوئی بھی پسند نہ ہو تو مجھے پہلے ایڈیشن کے لئے ۲۵ روپے عطا فرمائیں ہندی میں مجھے پانچ سو ملے تھے، گجراتی ایڈیشن کے مجھے سو روپے ملے۔ آپ جس طرح چاہیں فیصلہ کریں۔ ۲۵۰ روپے غالباً ضرورت سے زیادہ مطابقت نہیں ہے۔ میری ڈیڑھ سال محنت اور خامہ فرسائی کا نتیجہ یہ کتاب ہے اگر یہ شرطیں سب آپ کو ناگوار معلوم ہوں تو اپنی مرضی کے مطابق کتاب شائع کر کے مجھے جو چاہیں دیدیں۔ میں آپ کا مشکور ہوں گا۔ مجھے سخت ذلت معلوم ہوتی ہے کہ اپنی کتاب کے لئے پبلشرزوں کی خوشامد کرتا پھروں۔

(۲) "پریم بیتی" حصہ دوم کا قصہ "خونِ غفلت" مل گیا ہے۔ پہلا حصہ عنقریب تیار ہے۔ دوسرا حصہ بھی جلد نکلے تو بہتر۔ معلوم نہیں کاغذ دستیاب ہو یا نہیں۔ میرے پبلشر (ہندی) کلکتہ سے آپ کے لئے ہر ایک قسم کا کاغذ سمیٹتے کے ساتھ بھیجنے پر آمادہ ہیں۔ نصف قیمت پیشگی دیکار ہوگی۔ اگر آپ اسے منظور فرمائیں تو کاغذ کا آرڈر وغیرہ اس پتہ سے دے سکتے ہیں۔ میرا حالہ دینا ضروری ہو گا۔

شری یت ہا بیر پرشاد جی

بک سیلرز اینڈ پبلشرز

ہندی پبک ایجنسی۔ ۱۲۶ ہرسن روڈ کلکتہ

خط سے ظاہر ہے کہ پریم چند کی نظر سے کوئی بھی بات اوجھل نہیں ہوتی تھی۔ ہر ایک معاملے کی خواہ وہ کتنا ہی معمولی ہو، تفصیل میں جلتے تھے، "پریم بٹسی" کا دوسرا حصہ اسی دارالاشاعت پنجاب سے شائع ہوا تھا۔ "پریم بٹسی" اور "پریم بٹسی" کا پہلا حصہ انھوں نے خود شائع کیا تھا۔ اس سلسلے میں "پریم بٹسی" کا دیکھا چہ جو انھوں نے خود لکھا تھا قابل ذکر ہے لکھتے ہیں :-

"میری کہانیوں کا پہلا مجموعہ "پریم بٹسی" کئی سال پہلے شائع ہوا تھا۔ جہاں تک معاصر اخباروں کا تعلق ہے انھوں نے میری ناچیز کا دوش کی داد دی۔ لیکن شائقین پر اس کا بہت کم اثر ہوا۔ پہلا ایڈیشن ختم ہونے میں کم بیش پانچ سال لگ گئے۔ یہ قدر دانی بہت حوصلہ انگیز نہ تھی، لیکن مصنف کو تصنیف کے سوا چارہ نہیں۔ اس لئے یہ دوسرا مجموعہ "پریم بٹسی" کے نام سے پبلک کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ ممکن ہے کہ پہلے مجموعے کی نسبت اس کا زیادہ چرچا ہو۔ یا سارا طویار دفتر اشاعت کے گورام میں پڑا سرے۔ میں اپنے فرض سے سبک دوش ہو چکا۔ اب صرف اتنی آرزو ہے کہ ایک مجموعہ "پریم چالسا" یا "پریم بٹسی" کے نام سے اور نکل جائے۔ بس یہی زندگی کا حاصل ہوگا، اور اسی پر قناعت کروں گا۔

اس صوبے میں پہلے خیر دل کا قحط ہے۔ اس لئے یہ مجموعہ دو حصوں میں دو جدا جدا مقاموں سے نکالنا پڑا تاکہ زیادہ توقف نہ ہو۔ حالانکہ

یہ ہوتی ہو کہ کتب مفت مل جائے۔ اگر کوئی دھن کا پکا ادیب بارہ پندرہ فیصدی راکٹٹی طے بھی کر لیتا ہے تو وہ بھی اسے نہیں دی جاتی، پیشہ منافع میں اپنے شریک کار یک سیلروں کو تیس چالیس فیصدی کمیشن دیتا ہے اور باقی خود ڈو کارتا ہے ظلم ہوتا ہے بے چارے مصنف پر یہی حالت پریم چند کے ساتھ ہوئی تھی، ان کی اکثر کتابیں لاہور سے شائع ہوئی ہیں۔ دارالاشاعت کے علاوہ وہاں ان کے دوسرے پبلشرز لاجپت رائے اینڈ سنز تھے۔ ”غبین“ ”پردہ مجاز“ اور کہانیوں کا مجموعہ ”خواب و خیال“ انہی کے یہاں سے شائع ہوئے ہیں۔ پریم چند کو دونوں سے شکایت تھی۔ ایڈیٹر زمانہ کو اس سلسلے میں ۵ فروری ۱۹۳۶ء کے ایک خط میں لکھا ہے:-

”پردہ مجاز ابھی تک پبلشر نے نہیں بھیجا، کئی خطوط لکھ چکا، نہ روپے بھیجتا ہے نہ کتابیں، نہ جواب دیتا ہے۔ معلوم نہیں بیمار ہے یا کیا؟ ادھر ”غبین“ کا ترجمہ بھی شروع کر دیا ہے۔ ایک نیا ناول بھی شروع کر دیا ہے۔ مگر سرور بازاری بلا کے جان ہو رہی ہے..... کتابوں کی کافی بکری نہیں.....“

اوپنڈر ناتھ اشک کو ایک خط میں لکھا تھا....

یک سیلروں کا تجربہ آپ سے زیادہ مجھے پہنچا ہوا ہے۔ ایک پبلشر..... میرے ڈیڑھ سو روپے دیکے بیٹھا ہے۔ لاہور ہی میں ایک دوسرا پبلشر میرے سات سو روپے مضمم کرنا چاہتا ہے۔ اخبارات کا

حال ہے بک سٹیلرڈ کا یہ ، بے چارہ مصنف کیا کرے
 کتابیں بکنے اور چھپنے کے بارے میں پریم چند کو یہ شکایت آخری
 عمر تک رہی ۔ صرف اردو ہی پر موقوف نہیں ، ہندی میں بھی یہی کیفیت تھی
 اور پندرنا تھا اشک نے بنارس کینٹ سے ۹ جولائی ۱۹۳۶ء کو لکھا ہوا
 اُن کا حسب ذیل خط شائع کیا ہے ۔
 ڈیر اور پندرنا تھا

دعا۔ تم تعجب کر رہے ہو گے کہ میں نے تمہارے خط کا جواب کیوں
 نہیں دیا۔ میں پندرہ دن سے قیدی بستر ہو رہا ہوں ، ہاضمہ کی شکایت
 ہے ، جگر اور معدہ کی خرابی ، کوئی کام نہیں کرتا تمہاری پریشانیوں کا قصہ
 بڑھ کر رنج ہوا۔ اس مہاجنی دور میں پیسے کا نہ ہونا عذاب ہے ۔ زندگی
 خراب ہو جاتی ہے ۔ لیکن یہ بھی نہ بھولنا کہ غریبی اور مصیبتوں کا ایک
 اخلاقی پہلو بھی ہوتا ہے ۔ انھی آزمائشوں میں انسان انسان بنتا ہے ۔
 اس میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ۔

ہندی میں بھی تو یہی کیفیت ہے جو اردو میں ۔ کتابیں نہیں بکتیں ۔
 پبلشر کوئی نئی کتاب چھاپتے نہیں“

۱۹۳۶ء میں پنڈت بنارس داس چندریدی نے پریم چند سے
 تین سوالات دریافت کئے تھے ، ان میں سے ایک یہ تھا کہ آپ کو اپنی
 تصنیفات سے کتنی آمدنی ہوئی ؟
 پریم چند اس کے جواب میں لکھتے ہیں :-

”آبدنی کی کچھ نہ پوچھے۔ تمام ابتدائی کتابوں کا حق طباعت پیشتر کر دے دیا۔ سیواسدن“ ”پریم اشرم“ ”سپت سورج“ ”سنگرام“ کے لئے ہندی پستک ایجنسی نے ایک مشتمل تین ہزار روپے دئے تھے اور نوادھ کے لئے شاید اب تک دو سو روپے ملے ہیں۔ دو لاکھ لالہ جی نے ”رنگ بھومی“ کے لئے اٹھارہ سو روپے دئے تھے اور دوسرے مجھ سے کے لئے سو دو سو روپے مل گئے ہوں گے ”کایا کلیپ“ ”آزاد کتب“ ”پریم تیرتھ“ ”پریم پریتما“ ”پرتگیا“ میں نے خود چھاپیں۔ مگر مشکل سے ابھی تک چھ سو روپے وصول ہوئے ہیں۔ تصانیف سے متفرق آبدنی پچیس روپے ماہوار ہو جاتی ہے مگر کبھی کبھی اتنی بھی نہیں اور ترجموں میں شاید دو ہزار سے زائد نہیں ملا۔ آٹھ روپے میں رنگ بھومی اور پریم اشرم دونوں کے ترجموں کا معاملہ ہو گیا۔ ”سنس“ اور ”جاگرن“ کی اشاعت میں تقریباً دو سو روپے ماہوار کا نقصان ہو رہا ہے۔

پیشروں سے انھیں یوں دوچار ہونا پڑتا تھا، سود خور اور منافع خور مہاجنی دور سے انھیں جو نفرت تھی اس میں ان پیشروں کا اور کساد بازاری کا بھی بہت حصہ تھا۔ دیگر حالات کی طرح اس کیفیت کا عکس بھی ان کی تحریروں میں خوب ملتا تھا۔ غریب مصنف اور سرمایہ پیشروں میں جو فطری تضاد ہے۔ ”ڈیمان سٹرشن“ کہانی میں اس کی بہت صحیح تصویر پیش کی گئی ہے۔ اس میں جو مبلغہ کی رنگ آمیزی اور مصنفانہ اضافہ ہے وہ ان کی تخلیقی قوت کی دلیل ہے، ورنہ یہ کہانی

ذاتی تجربے اور مشاہدے پر مبنی ہے، لکھتے ہیں :-

”گورد پرساد کو ڈرامہ لکھ کر وہی خوشی حاصل ہوئی ہے جو ایک مصنف کو اپنی تصنیف مکمل کرنے کے بعد ہوا کرتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں نے بہت بڑا معرکہ سر کر لیا ہے، جس خلوص اور گرم جوشی کے ساتھ اس نے یہ تصنیف مکمل کی ہے اسی خلوص اور گرم جوشی کے ساتھ پبلشرز اور پڑھنے والے اس کا خیر مقدم کریں گے۔ ناٹک لکھنے کے بعد ناٹک کمپنی کے مالک سیٹھ سے سودا پٹانے کی بات آتی ہے اس کے لئے گورد پرساد کے دوست خوب ٹھاٹھ سے موڑ دل پر جانے کی تجویز کرتے ہیں تو سادہ لوح گورد پرساد کہتا ہے کہ سادے ڈھنگ سے ٹانگوں میں جانے سے کیا بُرائی ہے۔ اس پر اُسے جواب ملتا ہے۔

”دوند بہاری نے کہا۔ آپ تو گھاس کھا گئے ہیں۔ ناٹک لکھ لینا ایک بات ہے اور معاملے کو پٹانا دوسری بات ہے۔ روپیہ صفحہ منادے گا۔ اپنا سامنہ لے کر رہ جاؤ گے“

پریم چند کو کئی مرتبہ شاید روپیہ صفحہ بھی نہیں ملا تھا، کیونکہ اپنے آخری ناول ”گودان“ کے لئے جبکہ وہ اتنی شہرت حاصل کر چکے تھے روپیہ صفحہ سے زیادہ ملنے کی توقع نہیں رکھتے تھے۔ انھیں اکثر اوقات بہت معمولی رقم کے لئے اپنی کتابوں کے جلا حقوق بیچ دینے پڑے تھے۔ اردو کی لگ بھگ سب کتابوں کے حقوق پبلشرز کے پاس ہیں۔ ہندی کی البتہ وہ کتابیں بچ رہی تھیں جو انھوں نے

اور کرنی ہوگی، ڈرامہ کار ہر سلسلہ شروع ہو جائے گا تو آپ کو تھوڑے دن
کپہنی کے ساتھ رہنے کی تکلیف اٹھانی پڑے گی۔

چلے تو دوست سیٹھ کے ردیہ پر تنقید کر رہے تھے لیکن گوریہ
اس تنقید میں شریک نہ ہوئے، وہ اس طرح سر جھکائے چلے جا رہے تھے
گو یا اس حالت کو ابھی تک سمجھ نہ سکے ہوں۔“

آخر زندگی میں پریم چند کو کہانیوں اور مضامین کا معاوضہ ضرور ملنے
لگا جو بالکل ناکافی تھا۔ تاہم اس سسران کی بعض ضرورتیں پوری ہو جاتی
تھیں۔ اور کئی مرتبہ وہ ضرورت کے لئے لکھتے بھی تھے، اپنے فسانہ فلسفی
کی محبت میں لکھتے ہیں:-

”لاہ کوئی نا تھو کو اب ضرورتاً تصنیف کا شوق ہو گیا تھا۔
ادیب کا فرض کہانی میں جب ادیب کی بیوی تنگ دستی کی شکایت
کرتی ہے تو ادیب جواب دیتا ہے: ”دو ایک رسالوں سے میرے
مضامین کے روپے آنے میں شاید کل تک آجائیں۔“

ایک دفعہ ایک بنگالی کو انھوں نے دو تین سو روپیہ
دیا تھا، اور کچھ عرصہ گھر پر بھی رکھا تھا، وہ صاحب اپنے
اپ کو ادیب کہتے تھے اور پریم چند پر خوب زنگ چڑھایا
تھا۔ اس نے جب شادی کی تو شورانی دیوی سے چوری
چوری پریم چند نے اس کی بیوی کے لئے زیور اور کپڑے
ادھار بنوا دیئے، اور پھر چوری چوری کہانیاں اور مضامین

لکھ کر یہ رسم ادا کی۔ بنگالی بہت ہی غلط آدمی تھا، اس کا
 فکر انھوں نے اپنی ایک کہانی میں کیا ہے۔ ہندی میں اس کہانی
 کا نام ”دھپور سنگھ“ ہے۔ یعنی وہ آدمی جو باتیں بہت بنائے لیکن
 عمل میں کورا ہو۔

پریس

ادبی خدمت پوری عبادت ہے

(پریم چند)

جب چراغ کا کام جلنا ہے، وہ جلتا رہے گا اور اجالا پھیلاتا رہے گا،
لیکن آدمی جب چراغ بننے کا فرض شعوری طور پر انجام دیتا ہے تو وہ صرف
جلنے ہی پر اکتفا نہیں کرتا۔ اسے یہ فکر ہوتی ہے کہ جس اُجالے کو وہ جنم دیتا ہے
اُسے زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچائے۔ پریم چند اس دھن کے
ساتھ ادب کی تخلیق کرتے تھے، اور وہ چاہتے تھے کہ جو کچھ وہ لکھتے ہیں وہ
زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ جائے۔ اس لئے انھوں نے کچھ کتا میں خود
چھپوائیں اور کچھ منافع خور پبلشرز کو امانے پونے مہموں دے دیں

پھر بھی نشر و اشاعت کی ان کی اُرز و پوری نہیں ہوئی، اس لئے وہ چاہتے تھے کہ اپنا پسندنگ ہاؤس ہو، پریس ہو، جہاں ان کی اور دوسرے لکھنے والوں کی کتابیں آسانی سے چھپ سکیں۔ جلد سے جلد لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچائی جاسکیں۔

ملازمت کے دنوں میں ہی یہ جذبہ ان کے دل میں زور پکڑ گیا تھا اور مسلسل تحریک بنتا جا رہا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنی مرضی سے کام لیں تاکہ ان کی تمام تخلیقی قوتیں بروئے کار آسکیں۔ ایڈیٹر زمانہ کو بستی سے ایک خط میں لکھا تھا:-

"میں عاجز ہوں تو ماتحتی سے۔ کام ایسا کرنا چاہتا ہوں جس میں بجز میری طبیعت کے اور کسی کا تقاضا نہ ہو۔ جی میں اُمے تو رات دن کام کرتا رہوں۔ اور جی چاہے تو کچھ نہ کروں۔ مگر یہ صرف مالکانہ حیثیت سے ہو سکتا ہے۔"

ایک رات پریم چند جب بستی سے کانپور گئے تو وہاں گنیش مشنکر دیکھنے سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے نیا پریس لگایا تھا اور اپنا اخبار جاری کیا تھا پریم چند دویار بھی کے اپنے دفتر میں کام کاج کے ڈھنگ سے بہت متاثر ہوئے۔ گھروٹ کرشورانی دیہوی سے اس ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ گنیش مشنکر دویار بھی بڑے مخفی آدمی ہیں۔ پریس اور اخبار کا سارا کام خود دیکھتے ہیں مجھے ان کی کامیابی میں ذرا بھی شک نہیں، کیونکہ ایسا آدمی ضرور کامیاب ہو جاتا ہے جی چاہتا ہے کہ میں بھی اسی لگن سے کام کروں۔

لیکن ملازمت ترک کر دینے کے بعد بھی انھیں پریس کھولنے اور مانگنا
 حیثیت سے کام کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اس کے لئے پیسہ درکار تھا۔ چرنے
 کی دوکان کھولی تھی جو چل نہیں سکی۔ اس کے بعد کانپور کے مارواڑی اسکول
 میں ملازم ہو گئے۔ اس اسکول کے منیجر ایک صاحب کاشی ناتھ تھے۔ وہ کانگڑی
 اور ویش بھگت تھے۔ پریم چند انھیں بڑے بھلے مانس اور شریف سمجھتے تھے لیکن
 تجربے سے تن کے اُچلے اور من کے پیلے ثابت ہوئے۔ وہ بکھر دل کے ساتھ نہایت
 سختی اور بدفرجی سے پیش آتے تھے۔ اسکول کے منیجر کی طرح پورے ڈکٹیٹر
 تھے۔ پریم چند ان کا یہ رویہ کب برداشت کر سکتے تھے۔ جلد ہی ان بن ہوئی
 اور وہ مارچ سلاؤنڈ میں یہاں سے مستعفی ہو کر پھر بنارس چلے گئے اور اپنے
 جدی گاؤں ہی میں جا کر رہنے لگے۔ وہاں انھوں نے بڑے مکان کی جگہ میں
 چار ہزار روپیہ صرف کر کے پکا مکان بنوایا اور خیال تھا کہ یہیں عمر بھر بیٹھ کر
 لٹریچر کی کام کریں گے۔ مستعفی ہونے اور گاؤں جانے تک کے یہ حالات ان کی
 ”تحریک“ کہانی میں بہت اچھی طرح درج ہیں۔

کاشی ناتھ کے مارواڑی اسکول کی جگہ اس کہانی میں کالج کا ذکر ہے۔ لیکن
 بات وہی ہے لکھتے ہیں :- ”مجھ پر جاوے جا چلے کئے جانے لگے۔ میں
 خلوص کے ساتھ اصلاح و فلاح کی تجویز پیش کرتا، اس کی مخالفت کی جاتی
 بے معنی اور بکرا اعتراضات نے میرا نامک میں دم کر دیا
 میں نے استعفیٰ دے دیا۔ دنیا کا ایسا تلخ تجربہ اب تک

مجھے نہ ہوا تھا“

اور اس کے بعد گاؤں میں رہنے کی بات اس کہانی میں یوں لکھی ہے۔
 ”میں نے دنیا سے منہ موڑ لیا اور گوشہ گنہ گامی میں زندگی کے دن پورے
 کرنے کا ارادہ کر کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں مقیم ہو گیا۔ چاروں طرف اونچے
 اونچے ٹیلے تھے ایک طرف گنگا بہتی تھی۔ میں نے دریا کے کنارے ایک چھوٹا
 سا مکان بنالیا اور اس میں رہنے لگا۔“

مگر گاؤں میں دو بہت دن نہیں رہے۔ شو پر شاد گیت بنارس سے
 ہندی کا ایک ماہ وار رسالہ ”مربادا“ نکلتے تھے جس کے ایڈیٹر بابو سمپورن
 تھے۔ وہ مان کو آپریشن کے سلسلے میں گرفتار ہو کر جیل چلے گئے۔ ان کا عہدہ
 موجودگی میں پریم چند کو ”مربادا“ کا ایڈیٹر بنادیا گیا۔ دو تھ سال بعد بابو
 سمپورن آنند جیل سے چھوٹ کر آئے تو یہ کام بھران کے سپرد
 کر دیا گیا۔

”مربادا“ میں پریم چند کو ڈیڑھ سو روپے ماہوار ملتے تھے اس کے
 بعد سوسو روپے ماہوار پر کاشی دیا پیٹھ میں نیچر مقرر ہو گئے۔ یہ کام
 بھی ان کی طبیعت کے موافق نہیں تھا۔ صرف ایک سال بعد دیا پیٹھ کی
 ملازمت سے الگ ہو گئے۔

اب انھوں نے نشر و اشاعت کا کام شروع کرنے کا پکا ارادہ
 کر لیا۔ چنانچہ رگھوپتی سہائے فراق گورکھ پوری اور اپنے دو عزیزوں کی شرا
 میں انھوں نے بنارس میں سرسوتی پریس قائم کیا۔ اس میں انھوں نے خود
 ساڑھے چار ہزار روپیہ لگایا۔ لیکن جب منافع کی جگہ اٹا کچھ نقصان ہی

ہوا تو رفتہ رفتہ پریس کی ساری ذمہ داری صرف انھیں برآ پڑی۔ دوسرے حصے دار ایک ایک کر کے الگ ہوئے گئے۔

کسی کام کو اوصور اچھوڑنا نیکست قبول کرنا۔ پریم چند کی عادت نہیں تھی۔ وہ پوری استعداد سے ایک کام کے سچے پڑ جاتے تھے اور محنت اور لگن سے ناکامی کو کومیابی میں بدلنے کی کوشش کرتے تھے۔ پریس کے کام میں وہ پوری تندرستی سے لگ گئے۔ دن سارا پریس میں ہی ہوتا تھا پھر ملاقاتی آجاتے تھے۔ اس لئے پڑھنے لکھنے کا کام انکثرات کو کرتے تھے شعورانی دیوی کو ان کی یہ مصروفیت پسند نہیں تھی۔ صحت خراب تھی اس لئے کڑی محنت سے منع کرتی رہتی تھیں۔ کم از کم ان کا، انوں کو جاگنا قطعی پسند نہ تھا۔

ایک روز شعورانی نے اعتراض کیا تو پریم چند ہنس کر بولے، "بھائی تب کیا کیا کروں؟ صبح گھڑی صبح گھڑی ضروری ہوتا ہے، گھوم کر آتے ہی ناشتہ کر کے کام کرنے اپنے کمرے میں بیٹھ جاتا ہوں، خود بھی لکھتا پڑھتا ہوں ساتھ ہی تھارے بچوں کو بھی پڑھاتا ہوں۔ اس کے بعد پھر اٹھتا ہوں، نہانا دھونا ہوں، کھانا کھاتا ہوں، اس کے بعد پریس جاتا ہوں۔ پریس سے آکر ایک گھنٹے تک بچوں سے بات کرتا ہوں، انہیں، وہ بھی سب بچے ہو جائیں۔ پھر اسی کے ساتھ ساتھ اپنی بھی تہ نکان مٹ جاتی ہے۔ اس کے بعد پریس کا منشی آجاتا ہوں اسے کچھ نہ کچھ بولتا ہوں پڑتا ہے۔ پھر لو بجے اٹھ کر کھانا کھاتا ہوں۔ ایک گھنٹہ ہی باقی بچتا ہے۔ اتنی ہی دیر میں چاہے جو کچھ پڑھوں لکھوں اس پر سرکاری

حکم ہے کہ دس بچے سو جاؤ۔ سرکاری حکم ٹالا بھی جاسکتا ہے پر تمھارا تو ٹالا بھی نہیں جاسکتا۔ اب تمھیں بناؤ اس میں کتنا سسے میں نکال سکتا ہوں "لیڈر" تو میں پریس میں پڑھتا ہوں۔ میرا تو ایک ایک سیکنڈ بٹا ہوا ہے۔ میں تو ایشور سے منانا رہتا ہوں کہ رات چھوٹی ہوا کرے، دن بڑا "۔

(پریم چند گھر میں)

پریس میں انھوں نے ایک طرح اپنی روح ڈال دی تھی۔ بیماری تک کی پروا نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ شورانی دیوی گاؤں میں تھیں ادا تھیں بچپن ہو گئی تھی جو پیسے بیوی دلا کے لئے دینی تھیں وہ آپ پریس میں صرف کر دیتے تھے۔ دو مہینے بیماری ہی کی حالت میں گزر گئے۔ تب شورانی دیوی نے انھیں گاؤں چلنے کو کہا۔

آپ بولے: پریس کا کام کون کرے گا؟

شورانی: جب طبیعت اچھی نہیں ہو رہی ہے تو کیا کیجے گا؟

آپ: کام بھی تو مجھے بہت کرنا ہے۔

شورانی: کام بھاڑ میں جائے۔ ایک نہ ایک تو لگا ہی رہے گا۔

آپ: کیا بھاڑ میں کام چلا جائے گا؟ اسے تو پورا کرنے ہی سے چھٹی ہو

فردی ۱۹۳۱ء عر کو پریس میں ہڑتال ہو گئی تھی۔ شورانی دیوی

نے اس کا ذکر اس طرح کیا۔

"میرے پریس میں ہڑتال ہو گئی تھی۔ آپ وہاں سے آئے اندست

سے بیٹھے رہے۔ میں انھیں ادا س دیکھ کر پوچھ بیٹھی کہ آپ کی طبیعت کیسی ہو؟

آپ بولے۔ طبیعت تو بہت اچھی ہے۔

میں بولی۔ تو اُداس کیوں ہیں ؟

آپ بولے۔ اس پریس کے کارن مجھے بڑی پریشانی رہتی ہے۔

میں بولی۔ کیا ہے ؟ بتاؤ تو۔

”کیا بتاؤں منیجر اور مزدوروں میں پتی ہی نہیں“

”وہ کام نہ کرتے ہوں گے، منیجر بے چارہ کیا کرے ؟“

”بھائی منیجر بھی تو اپنے کو خدا سے کم نہیں سمجھتا“

”خدا کیوں سمجھے گا اپنے کو ؟ اگر ٹھیک ٹھیک کام نہ کرے تو آپ بھی

تو اس پر بھگڑیں گے“

”ذرا سی بات پر تو لوگوں کو غیر حاضر کرتا ہے، پیسے کاٹتا ہے“

”تو پھر اس کا کیا دوش ؟“

”نہیں منیجر کی سب شرارت ہے، کبھی گھڑی کو سست کر دیتا ہے

کبھی تیز کر دیتا ہے۔ میں نے اکانت میں بھی بیسیوں بار سمجھا دیا ہے بابا ایسا

کر۔ پرمانے تب نہ۔ پھر پریس میں تو طرح طرح کے گھائے ہیں۔ کیا انہی

مزدوروں کے بل پر گھائے پورے ہوں گے۔ ہم لوگوں کو تو زیادہ روپے

میلے ہیں۔ پر خرچ بھر کا پورا نہیں پڑتا۔ تب غریبوں کو کیسے پورا پڑے گا

پیسوں کی مصیبت تو ان لوگوں کے سر پر ہے۔ ان لوگوں کی تنخواہ تب نہیں

کتنی، جب یہ سہفتوں غائب رہتے ہیں، تب کیوں مزدوروں کی ہی تنخواہ

چار منٹ دیر سے آئیں تو کوٹ جائے ؟ ذرا بھی دیر ہوئی کہ چٹ نکال کر

دوسرے کو بلالیا، ہمارے یہاں پڑھا لکھا سماج سب زیادہ خود غرض ہو گیا ہو؟
 ”ایک کے پیچھے آپ سارے سماج کو بدنام کر رہے ہیں؟“
 ”میرا کہنا تم سچ مانو؟“

”تو پھر آپ اپنے کو دوش دیجئے۔ منیجر کو کیوں دوشی ٹھہرتے ہیں؟“
 آپ بولے: ”میں تو کبھی نہیں اپنے چھوٹوں سے لڑتا۔ ہر جگہ یہی اتیاچار (ظلم) ہے، اگر یہ اپنے سے چھوٹوں کو برابر کا سمجھیں تو جھگڑا ہڑتال کبھی نہ ہو۔ حرکتوں سے توان کی ہڑتال ہو۔ پر بدنامی اور ہار میری ہو۔ اب جب تک ہڑتال ختم نہیں ہوگی۔ تب تک سارا کام رکا پڑا ہے۔ طبیعت اُدھر لگی رہتی ہے، کام کیا ہوگا خاک؟“
 میں بولی: ”آپ کی طرح منیجر بھی بیٹھا رہے گا۔ یہ مزدور بھی کسی سے کم ٹھہرے ہی ہیں۔“

آپ بولے: ”نہیں جی، وہ مزدوروں سے بڑھ کر ہیں۔ دیکھتا ہوں برابر نقصان ہو رہا ہے پر بولنا نہیں ہوں، کام لینے کے ڈھنگ بھی ہوتے ہیں۔“ (پریم چند گھر میں)

یہ ان کا طریقہ تھا، یہ مشکلات تھیں، لیکن نقصان اٹھاتے ہوئے بھی پریس کو چلا رہے تھے۔ بیچ میں تو کڑی بھی کرنی پڑی لیکن ایک دفعہ شروع کر کے پریس بند نہیں کیا ”کایا کلب“، ”غبن“ اور ”کرم بھومی“ اور ”گودان“ آپ نے اسی پریس میں شائع کئے۔ اس کے علاوہ ”مان سرود“ اور ”پریم ننادی“ وغیرہ کہانیوں کے مجموعے بھی اسی پریس میں چھپے۔

اب اتنا ہو گیا کہ جو کچھ وہ لکھتے تھے کم از کم ہندی میں جلدی چھپ جاتا تھا۔ لیکن کساد بازاری کے باعث کمزور میں بکتی نہیں تھیں شاک پڑا رہتا تھا اور بک سیر بھی رقم جلدی نہیں لوٹاتے تھے۔ کتابوں کا ریو یو وغیرہ کرنے میں کافی جھنجھٹ رہتا تھا۔ مگر پریم چند کسی کام کو بھی نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ ہر ایک بات کا دھیان رکھنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کا ایک خط قابل ذکر ہے۔ انھوں نے "گنودان" کی ایک جلد مادھوری میں برائے ریو یو بھیجی۔ ایڈیٹر بانکے بہاری لال نے دو جلدیں طلب کیں۔ آپ نے اس کے جواب میں جو خط لکھا وہ حسب ذیل ہے :-

پریم بانکے بہاری لال جی

آپ "گنودان" کی آکوچنا کر رہے ہیں۔ یہ جان کر بڑا آندہ پایا۔ ساتھ ہی کی آج کل جو درگتی ہو رہی ہے اس کی کچھ نہ کچھ ذمے داری پتر کاروں پر بھی آتی ہے، جن میں ایک میں بھی ہوں۔ چاہئے تو یہ کوئی اچھی چیز نکلے تو اس کا سوا گت کیا جائے۔ لیکھک کو برا دسا ہمت کیا جائے، اور پرتین کیا جائے کہ بستک کی کھپت ہو اور نیکھکوں تنہا پر کاشکوں کا دل بڑھے۔ مگر پرکاشک تو یہاں سے ہی نہیں۔ آپ آج کوئی بستک لکھ کر پرکاشک کھوجنے نکلیں تو آپ کو سوچے بھارت درس میں ایک بھی نہ ملے گا جو آپ کی محنت کا کچھ معاوضہ دے یا رانٹلی پر ہی چھلے۔ رانٹلی پر چھاپ بھی دے گا

ایڈیٹر

ادیب انسانیت کا، علویت کا، شرافت
کا علم بردار ہے۔ جو پامال ہیں، مظلوم ہیں، محروک
ہیں، چاہے وہ فرد ہوں یا جماعت، ان کی حالت
اور وکالت اس کا فرض ہے۔ اس کی عدالت
سوسائٹی ہے اس عدالت کے سامنے وہ اپنا
استغاثہ پیش کرتا ہے۔ (پریم چند)

پریم چند کا ایم لے پاس کر کے وکیل بننے کا ارمان تو پورا نہ ہوا، لیکن
انھوں نے جلد سمجھ لیا کہ پیشہ ور وکیل بننے کی بہ نسبت جتنا کاسچا اور انسان
دوست وکیل بننا کہیں اچھا ہے۔ (ارب کے ذریعے یہ فرض سہرا انجام دینے

کا کام انھوں نے اپنے ذمے لیا، کہا نیاں اور نادل لکھ کر تودہ منطوق نہایت کی وکالت کرتے ہی تھے۔ لیکن چلہستے تھے کہ جس عدالت میں انھیں اپنا استعفاء پیش کرنا ہے اس کے دائرے کو اور وسیع کیا جائے۔ اس لئے ان کے دل میں ایک عرصے سے کسی رسالے کا ایڈیٹر بننے کی اُمنگ تھی۔ اُن کی زندگی کا یہ بھی ایک سنہرا سپنا تھا۔

سنہ ۱۹۰۸ء میں جب وہ نواب رائے کے نام سے لکھتے تھے انڈین پریس آباد کے پرنسپل پرائیمری ٹیچر منشی گھوش نے انھیں کانپور سے بلایا تھا۔ ان کا ارادہ ایک ماہوار رسالہ نکالنے کا تھا اور وہ اس کی ادارت منشی نواب رائے کے سپرد کرنا چاہتے تھے۔ معاملہ کر کے پریم چند کا پنورس لٹے تو احباب نے مشورہ دیا کہ ملازمت ترک کرنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ ایک سال کی رخصت لے لیں۔ اگر اس عرصے میں پرچہ چل گیا تو رہیں ورنہ پھر آکر ماسٹری کریں۔ یہ مشورہ انھیں پسند آیا۔ پرچے کا نام انھوں نے ”فردوس“ تجویز کیا تھا۔ مگر بعض وجوہ سے تجویز التوا میں پرگئی پرچہ نکل نہیں سکا۔

ویسے وہ اس زمانے میں رسالہ ”زمانہ“ اور ہفتہ وار اخبار ”آزاد“ کے اعزازی اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے۔ منشی دیانارائن نیگم کی دوستی اور شرافت کی خاطر انھیں اُن کے لئے بہت کچھ لکھنا پڑتا تھا۔ اس طرح انھوں نے ادارت کے قاعدوں اور اصولوں سے واقفیت حاصل کر لی تھی۔ اور انھی دنوں ایڈیٹر کے فرائض اور اہمیت کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ اپنی کہانی ”ڈگری کے روپے“ میں لکھتے ہیں :-

”اخبار کا ایڈیٹر ہمیشہ قاعدوں کے مطابق قوم کا خادم ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتا ہے کرنا ہے قومی وسیع النظری سے جو کچھ سوچتا ہے اس پر بھی قومیت کی ہر لگی ہوتی ہے۔ ہمیشہ قومی خیالات کی وسیع فضا میں گھومتے رہنے سے شخصی اہمیت کا دائرہ اس کی نگاہوں میں بہت تنگ ہو جاتا ہے۔ وہ شخصیت کو بیچ، حقیر اور ناقابلِ توجہ خیال کرنے لگتا ہے۔ شخصیت کو قومیت پر بھٹا کر دیتا ہے۔ اس کی زندگی کا مقصد عظیم اور معیار پاکیزہ ہوتا ہے وہ ان زبردست شخصیتوں کا مقلد ہوتا ہے جنہوں نے قوموں کو بنایا اور سنوارا ہے جن کا نام امر ہو گیا ہے جو مظلوم قوموں کے لئے نجات دہندہ ثابت ہو چکی ہیں وہ حتی الامکان کوئی کام ایسا نہیں کرتا جس سے اس کے پیش روؤں کی جھلکتی ہوئی شہرت میں داغ لگ جانے کا اندیشہ ہو۔“

پریم چند نے ہمیشہ اس آدرش کو اپنے سامنے رکھا۔ ان کی کہانی ”غنت“ کے ہیرو کاؤس جی بھی اسی آدرش کے مالک ہیں۔ لیکن آدرش بھی ہوا میں نہیں پیتے۔ ہر ایک آدمی کو آدرش کے ساتھ ہی اپنی مادی ضرورتیں بھی پوری کرنی پڑتی ہیں۔ اگر وہ پوری نہ ہوں تو آدرش بھی ڈگمگا جاتا ہے۔ کاؤس جی اخبار سے قوم کی خدمت کر کے شہرت تو حاصل کرتے ہیں، لیکن دولت سے محروم رہتے ہیں۔ روٹیوں تک کے لالے ہیں۔ پھر بیدی سے بھی نہیں بنتی۔ وہ بہت ہی تلخ مزاج واقع ہوئی ہے۔ اسے کاؤس جی کے آدرشوں سے کوئی ہمدردی نہیں صرف اپنی مادی ضرورتوں پر نظر رہتی ہے۔ اس حالت سے تنگ آکر کاؤس جی اپنے پڑوسی شاہ پور جی کی دولت اور ان کی باسیلیقہ اور

حسین بیوی خیرہنی کو لپھائی ہوئی نکلا ہوں سے دیکھتے ہیں۔ پریم چند ان کی فطرت کے اس کمزور پہلو کو حقیقت کی روشنی میں دیکھتے ہوئے لکھتے ہیں:-
 ”خلوے کی جگہ چٹری روٹیاں بھی ملیں تو آدمی صبر کر سکتا ہے۔ مدد بھی مل جائے تو شاید وہ صبر کرے۔ لیکن سوکھی گھاس سامنے دیکھ کر فرشتے بھی آپے سے باہر ہو جائیں گے۔“

پریم چند اپنے ہیرو کی اس فطری کمزوری کو چھپانے نہیں۔ اُسے بڑھنے کی چھوٹ دیتے ہیں۔ آخر جب شیریں اپنے دو لقمہ خاندن کی بے راہ روی اور بے ہریوں سے تنگ اگر اپنا ہاتھ کاؤس جی کے ہاتھ میں دینے کو تیار ہو جاتی ہے، کہتی ہے، مجھے اپنے ساتھ چلو۔ اب میں اس گھر میں رہنا، نہیں چاہتی تو ایک ایڈیٹر ہوش میں آتا ہے، اس کا ضمیر اسے تاویب کر رہا ہے اُسے اپنی بے سرو سامانی اور بیوی کی وفاداری یاد آتی ہے، وہ اپنی کمزوری کا بھرپور تجربہ کرتا ہے۔ اسے حقیقت کا علم ہوتا ہے کہ یہ عیش و عشرت کی پروردہ تنلی شیریں اس کے ساتھ کتیا میں کیسے رہ سکے گی۔ لکھتے ہیں:-
 ”وہ کتیا تو اسی لئے ہے کہ ایک ایڈیٹر عابدانہ محویت کے ساتھ حق اور انصاف اور آزادی کی پرستش کرے۔ امارت اور نفاست کے لئے وہاں جگہ کہاں؟“

اس حقیقت کو سمجھ کر اپنی بیوی گلشن کے ساتھ اپنے رویے کا خیال آتا ہے:-

”اُن کے آئین میں غصہ اور سٹ دھری بہت بڑے گناہ تھے۔ پھر

وہ مجلس پر کیوں برہنہ شمشیر کی طرح ٹوٹ پڑتے تھے۔ کیا اس لئے کہ وہ ان کی دست باندھی ہے اور روٹھ جانے کے سوا انھیں اور کوئی سزا نہیں دی جاسکتی، کتنی کمینہ خود غرضی ہے کہ اقتدار اور اختیار والوں کے سامنے دم ہلائیں اور جو ان کے لئے اپنی زندگی قربان کر سکتی ہے اور کرتی ہے اُسے کاٹنے دوڑیں۔

پریم چند کا دس جی جیسے با اصول ایڈیٹر کی کمزوری اور کج روی کو فطری تقاضا سمجھ کر معاف کر دیتے ہیں۔ بلکہ ان کے ہاں معافی کا تو سوال پیدا ہی نہیں ہوتا وہ اس کے جذبات سے پوری ہمدردی رکھتے ہیں اور آخر میں اس کے ہاتھ میں آدرش کی شمع پکڑا کر اس کی انسانیت کے درجے کو وہ چند کر دیتے ہیں۔

لیکن اس کے برعکس جو لوگ محض نام و نمود کے لئے اور دولت کمانے کے لئے اخبار نکالتے ہیں، اور ان میں ایڈیٹر بننے کی کچھ بھی صلاحیت نہیں ذاتی اصلاح کا ذرا بھی مادہ نہیں، ایسے لوگوں کی پریم چند خوب گت بناتے ہیں۔ ”گنودان“ کا اونکار داس ایک ایسا ہی ایڈیٹر ہے۔ اس کے نزدیک اخبار نویسی کا مقصد دولت اور عیش و عشرت کے سامان حاصل کرنے کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس لئے وہ اپنے اخبار کے ذریعے بلیک میلنگ بھی کرتا ہے اور بڑے آدمیوں — مطلب اقتدار پسند طبقہ کی چالوسی بھی کرتا ہے اور پھر پارسی اور اصول پرستی کا دم بھی بھرتا ہے۔ پریم چند مس مانتی کے ہاتھوں اس کی جھوٹی پارسی اور زہد کا تمسخر اڑوا کر بے اختیار

تہمہمہ بند کرتے ہیں۔ اسے کاؤس جی کی طرح راستے سے نہیں ٹٹانے۔ کیونکہ وہ ذیلیاں اور پست ہے، لوٹ ہی نہیں سکتا۔ اسے اپنی اصلی جگہ پسٹی اور ذلات کے گڑھے کی طرف پھسلنے دیکھ کر اور دھکیل دیتے ہیں اسے شراب پلا کر کہتے ہیں۔

”قانون بھی تو بندھن ہے اسے کیوں نہیں توڑتے؟ بس وہی بندھن توڑو جو اپنی ہوس رانیوں میں رکاوٹ ڈالتے ہوں۔“

پریم چند نے اپنے ذہن میں ایڈیٹری کا جوا علی معیار اور آڈیشن قائم کر لیا تھا اس پر وہ عمل بھی کرنا چاہتے تھے۔ یہ تبھی ہو سکتا ہے جب وہ مالک کی حیثیت سے اپنا اخبار نکالتے۔ کاروباری ڈھنگ اور منافع کی غرض سے جو اخبار اور رسلے نکل رہے تھے ان کا ایڈیٹر بن کر اس جذبے کی تسکین ممکن نہیں تھی۔

پھر بھی ایڈیٹر نہ ہونے سے ایڈیٹر بننا اچھا تھا۔ اس لئے ملازمت سے مستعفی ہونے کے بعد جب ۱۹۲۲ء میں انھیں ”مریاد“ کا ایڈیٹر بننے کی پیش کش کی گئی تو وہ انھوں نے ہنسی خوشی قبول کر لی اور ڈیڑھ سال تک اس پرچے کو نہایت خوبی سے مرتب کرتے رہے۔ لیکن کاروباری پرچوں میں خوبی کے مقابلے میں مصلحتوں پر زیادہ نظر رہتی ہے۔ چنانچہ اس نظام میں جیسے باپ کی وراثت بیٹے کو ضرور مل جاتی ہے۔ بابو سمپورن آنند کے جیل سے رہا ہوتے ہی انھیں ”مریاد“ کی ایڈیٹری سونپ دی گئی۔

پریس لگانے کا دعویٰ یہ تھا کہ کتا میں چھاپنے کے علاوہ اپنا اخبار

اور رسالہ بھی نکالیں گے۔ لیکن مالی مشکلات کی وجہ سے ان کا یہ خواب جلد بڑا نہ ہوا بلکہ پریس چلانا بھی مشکل تھا۔ انھیں خود اپنی روزی کمانے کے لئے مسئلہ میں لکھنؤ جانا پڑا۔ وہاں وہ دارالاشاعت گنگا پستک مالا کے دفتر میں مرزا محمد عسکری وغیرہ کے ساتھ درسی کتابیں تیار کرنے کا کام کرتے رہے یہاں وہ دس ماہ سے زیادہ نہ رہ سکے۔ ایک تو تنخواہ بہت تھوڑی تھی، صرف سو روپے ماہوار ملتے تھے جس سے گزارہ نہیں چلتا تھا۔ پھر کام بھی طبیعت کے موافق نہیں تھا۔ سکولوں کے لئے جس قسم کی کتابیں تیار کی جاتی تھیں وہ انھیں پسند نہ تھیں۔ وہ اپریل ۱۹۲۶ء میں پھر بنارس لوٹ آئے اور دو سال جون ۱۹۲۸ء تک وہیں رہ کر ناموافق حالات کے خلاف جنگ کرتے رہے۔ مگر پریس سے کچھ بھی فائدہ نہیں ہوا۔ جولائی ۱۹۲۹ء میں نول کشور پریس کے مالک منشی بشن نارائن نے انھیں پھر لکھنؤ بلا لیا۔ ان کے مطبع سے مشہور ہندی رسالہ ”ماہووری“ نکلتا تھا۔ پریم چند کو اس کا ایڈیٹر بنا دیا گیا۔ اور وہ نومبر ۱۹۲۹ء تک نول کشور پریس میں مطبع کی مختلف خدمات سرانجام دیتے رہے۔ اس عرصے میں منشی بشن نارائن وفات پا گئے اور ان کی ریاست کو ریٹ آف وارڈ میں چلی گئی۔ پریم چند کو مطبع سے اپنا تعلق منقطع کرنا پڑا۔

”ماہووری“ اب بھی نکلتا ہے، لیکن پریم چند کے زمانے میں اسے جو مقبولیت اور کامیابی حاصل ہوئی وہ اس زمانے کی تاریخ میں یادگار بن کر رہ گئی۔ پھر کبھی وہ بات نہیں بنی۔ رسالے کی مقبولیت کے سلسلے میں ایک

کہانی کا ذکر ضروری بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ پریم چند نے موٹے رام شاستری پر جتنا لکھا ہے۔ ہاتھ گاڑھی پر بھی نہیں لکھا ہو گا۔ ۱۹۲۹ء میں اُن کی ایک کہانی ”موٹے رام شاستری“ کے نام سے شائع ہوئی، جسے پڑھ کر ایک شاستری ہاشٹ نے ان پر اور اُن کے دوسرے ساتھی ایڈیٹر کرن بہاری مصر پر مقدمہ کر دیا۔ اس کہانی سے مادھوری کے مالک بنن نارائن بھی خوش تھے۔ مقدمہ ٹھٹھاٹھ سے لڑا گیا۔ دو بیرسٹر ڈیرہ دون سے اُنے تھے کہانی کا اور اس مقدمے کا خوب جرجا ہوا۔ شاستری ہاشٹ نے مقدمہ ہار گئے۔ جج نے اُن سے کہا ”آپ کو کچھ اور کہنا ہے۔ بہتر ہے کہ آپ کھڑکی کے رستے چپکے سے باہر نکل جائیں۔“ پریم چند یہ سن کر مسکرائے۔ ”مادھوری کا وہ پرچہ ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔“

جب وہ مادھوری کے ایڈیٹر تھے۔ تبھی انھوں نے جنوری ۱۹۳۰ء میں اپنا پرچہ ”بہنس“ جاری کر دیا تھا جو اُن کے اپنے سرسوتی پریس بنارس سے شائع ہوتا تھا۔ پریم چند جانتے تھے کہ ایڈیٹر کا کام نئے نئے لکھنوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور ان کی تخلیقی قوتوں کو زیادہ سے زیادہ بیدار کرنے اور بڑھانے میں مدد دینا ہے۔ چنانچہ نئے ادیبوں کی چیزوں کو بڑی محنت اور جاں فشانی سے اصلاح کر کے چھاپتے تھے اور دوستانہ اور پدرانہ شفقت کے ساتھ انہیں نیک مشورے دیتے اور ان میں مطالعہ کا شوق بڑھاتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک دو خط ملاحظہ ہوں جو انھوں نے ادیب راناٹھ اشک کے نام لکھے تھے۔ اشک نے ان دنوں لکھنا شروع کیا تھا ”بہنس“

میں اپنی چیزیں چھیننے کے لئے بھیجا کرتے تھے۔
گنیش گنج، لکھنؤ

پریرہ بندھو

۲۵ فروری ۱۹۴۷ء

آشیر داد! معاف کرنا، تمہارے دو خط آئے "ہیشی کی بیوی"
میں نے پڑھا تھا اور بہت پسند کیا تھا۔ تم نے اردو کا ایک اور چھوٹا سا چٹلا
بھیجا تھا۔ میں اسے ہندی میں دے رہا ہوں۔ مگر ہندی میں جو چیزیں
تم نے اب تک بھیجی ہیں، ان میں ابھی زبان کی بہت خامی ہے۔ ہندی کے
پتہ دیکھتے رہو گئے تو سال چھ مہینے میں یہ ترٹیاں دور ہو جائیں گی۔ کوئی کہانی
ہمارے لئے ہندی میں لکھیو۔ مگر کہانی ہونیسی نہیں، اگر کسی مہان دیکھی
کا جیون چہرہ ہو تو اس سے بھی کام چل سکتا ہے۔ مگر میری صلاح تو یہی
ہے کہ بہت زیادہ لکھنے کے مقابلے میں لڑکچہ اور فلاسفی کا ادھنیں لکھ کر
جاؤ، کیونکہ اس وقت کا ادھنیں زندگی بھر کے لئے آپ یوگی ہو گا۔

اور تو سب خبریت ہے

سبھیش دھنپ رائے

گنیش گنج، لکھنؤ

ڈیر اوپندر

۳۰ مارچ ۱۹۴۷ء

آشیر داد! کئی دن ہوئے تمہاری ہندی کہانی مل گئی۔ اس کے پہلے
"پھول کا انجام" اردو کی چیز تھی، میں اس ہندی کہانی میں ضروری سدا

لے نقائص لے بڑی شخصیت لے سوانح حیات لے مطالعہ

کہے تھیں "میں دے رہا ہوں۔ لیکن تم نے فریڈر کو بلا کافی کارنوں کے شادی کرنے پر آمادہ کر دیا۔ وہ شادی سے بیزار ہے۔ دو اہم جیون کا درخشہ دیکھ کر اس کی طبیعت اور اداسین ہو جاتی ہے۔ پھر یکا یک وہ شادی کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ محض اس لئے کہ اس کی فٹکنی ہو گئی ہے۔ شادی کے بعد کا جیون ضرور سدر ہے۔ لیکن یہ کون کہہ سکتا ہے کہ جن میاں بیوی کو اس نے لڑتے دیکھا تھا، ان کا جیون بھی یوڈن کی پہلی مدھار تو میں اتنا ہی اکر شک نہ رہا ہوگا؟ ہمیں کوئی ایسا سین دکھانا چاہئے تھا جس میں انسان کو اپنا اکیلا پن اسٹہ ہو جانا میاں بیوی میں جنگ ہونے کے باوجود بھی ان میں ایسا چار ترک سونڈر نہ ہوتا جو انسان کو شادی کی طرف جھکنے پر دوش کرتا۔ موجودہ حالت میں قصہ CONVINCING دوشاوش پیدا کرنے والا نہیں ہے۔ "پھول کا انجام" اس سے اچھا ہے۔ اس میں ایک نکتہ ہے ایک پٹرن سستی ہے۔ لیکن اردوے کر میں کیا کروں!

پڑھنے کے لئے لائبریری سے سائیکلو جی کی کوئی کتاب لے لو، اسکو لی یا کورس کی کتاب نہیں۔ ابھی ایک کتاب نکلی ہے (THE ESPECTS OF A NOVEL) اس دشتے پر اچھی کتاب ہے۔ مطلب صرف یہ کہ

لہ شادی شدہ زندگی لہ نظارہ لہ جوانی لہ خوش گوار موسم لہ دلکش
 لہ ناقابل برداست لہ کرداری حسن لہ مجبور لہ مستقل
 لہ موضوع

انسان اُدارو چالا والا ہو جائے، اس کی سمیڈنائیں ویاپک ہو جائیں۔
ڈاکٹر ٹیگور کے ساتھ ٹیک اور دارشنگ بندھ بہت ہی اعلیٰ درجے کے
ہیں۔ رومال رولاں کا ڈو یکانند "ضرور پڑھو۔ ان کی "گاندھی" بھی
پڑھنے کے قابل ہے۔ مارلے کے ساتھ ٹیک جیون لاجواب ہیں۔ ڈاکٹر
رادھا کرشنن کی درشن سمبندی کتابیں ٹاسٹائے کا WHAT
IS ART وغیرہ کتابیں ضرور دیکھنی چاہئیں۔

اختر صاحب سے میرا سلام کہنا۔ میں ایک ہندی قصہ لکھ رہا ہوں اور
وہ آپ کے لئے وقف ہے۔

تمہارا خیر اندیش و صنیعت رائے
خطا اور بھی ہیں لیکن دکھانا یہ مقصود ہے کہ پریم چند نے لکھنے والوں
پر اتنی محنت صرف کرتے تھے۔ خطوں میں ہی نہیں لکھ رہے تھے جو ادیب اپنی
چیزیں دکھانے یا سننے آتے تھے وہ انھیں ادبی نکات بڑے تحمل اور سلیقے
سے سمجھایا کرتے تھے۔ یوں وقت ضائع کرتے دیکھ کر شورانی دیوئی
چڑھ کر کہا تھا۔ تم نے کیا تمام دنیا کو سکھانے کا ٹھیکہ لیا ہے تو پریم چند نے
ہنس کر جواب دیا تھا کہ یہی لوگ تو آئندہ چل کر ادب کی باگ ڈور سنبھالیں
گے۔ جب وہ ادب کو سماج کی بھلائی اور فائدے کی چیز سمجھتے تھے تو کیوں
اسے تحریک بنانے کی کوشش نہ کرتے۔ ادبی تحریک تقویت پہنچانے کے لئے

لے خراج، دسے سہریاں سہ ہر گہرے سرویدی شہ فلسفانہ شہ مفین
شہ سماع عریاں۔

تو تنہیں لکھا لکھا تھا۔

”تنہیں“ اور ”جاگرن“ کے مضامین وہ بڑی محنت سے لکھتے تھے اور انہیں ہمیشہ باقاعدگی اور پابندی کے ساتھ نکالنے کا خیال رکھتے تھے۔

۱۹۳۵ء کی بات ہے وہ کئی روز سے بیمار تھے۔ رات بھر بخار رہا کھانا تو کیا دو دھت تک نہیں پیا۔ صبح چار بجے بخار اُترا تو آپ ہمیشہ کی طرح ہاتھ منہ دھو کر ”تنہیں“ کے لئے ایڈیٹوریل لکھنے بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد شورانی دیوہی نے آکر جب انہیں لکھتے دیکھا تو وہ بہت ناراض ہوئیں پریم چند نے حسب عادت تنہیں کو جواب دیا، مضمون نہیں لکھوں گا تو تنہیں کیسے چھپے گا؟ ”تنہیں“ اگر وقت پر نہیں نکلے گا تو گاہک پریستانی ہوگی۔ وہ یہ تھوڑا جانتا ہے کہ میں بیمار ہوں۔ اس نے پیسے دئے ہیں اور وہ وقت پر ”تنہیں“ چاہتا ہے۔“

لیکن شورانی دیوہی نہیں مانتی، کہا ”اب لکھو گے تو قلم توڑ دوں گی“ کاغذ بھاڑ دوں گی پریم چند نے لاچار ہو کر کمپوزٹر کو ایک گھنٹے میں دوبارہ آنے کی بات کہہ کر لوٹا دیا۔ شورانی سے پھر لوے، ”تم نے مجھے لکھنے نہیں دیا۔ آدمی بیکار بیٹھے ہیں۔“

شورانی: تو تنہیں کون موتی رنگ رہا ہے۔

پریم چند تنہیں کو بولے، صاحب تنہیں موتی نکلتا نہیں، چنتا ہے۔

بحث پھر بھی جاری رہی۔ دیوہی نے کہا ”تم اتنا تباگ کس لئے کر رہے ہو؟“ پریم چند سادگی سے بولے، ”تباگ نہیں نشہ ہے۔ اگر میں یہ کام نہ

کروں تو مجھے تسکین نہیں ملتی۔

وہ اس دھن سے ہنس کو چلا رہے تھے۔ ہر ماہ لگ بھگ دو سو روپے ماہوار خوار خوار رہتا تھا۔ کئی مرتبہ ادیبوں کو معاوضہ کا وعدہ کر کے مضامین حاصل کرتے تھے اس سے نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا بھی مقصود ہوتا تھا۔ لیکن نقصان کے باعث وہ نہیں پاتے تھے تو لکھنے والے ناراض ہو جاتے تھے۔ وہ انھیں پیار سے سمجھا دیتے تھے۔

اسی خرچ کے باعث بیچ میں ہنس انھوں نے ہندی پرنسز والوں کو بھی دے دیا تھا۔ ایڈیٹر پریم چند خود تھے، لیکن پیسہ وہ لوگ خرچ کرتے تھے۔ لیکن وہ زیادہ دنوں خرچ برداشت نہیں کر سکے۔ آخر طے پایا کہ ہنس پریم چند سے بالکل لے لیا جائے اور پرنسز اپے انتظام میں نکالے۔ اس بات کا پریم چند کو جو دکھ ہوا وہ اختر حسین رائے پوری کے نام ان کے ایک خط سے ظاہر ہے۔ تاریخ نہیں ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ سن ۱۹۳۵ء میں لکھا گیا ہے۔ کیونکہ اس سال گنودان چھپ گیا تھا اور پرنسز نے "ہنس" کو ۱۹۳۵ء میں اپنے انتہام میں لیا تھا۔

ڈیر اختر

تمہارا خط ملا، میں اس فکر میں تھا کہ تم نے اب تک میرے خط کا جواب کیوں نہیں دیا۔ اب معلوم ہوا کہ تم پہاڑوں کی سیر کر رہے ہو۔ اب میرا قصہ سنو، میں قریب ایک ماہ سے بیمار ہوں، معدہ میں گیسٹرک الٹر کی شکایت ہے۔ منہ سے خون جاتا ہے، اس لئے کام کوئی نہیں

ہندی پر شد اور ستا سا ہتہ منڈل گاندھی جی کی دیکھو دیکھو میں چل رہے تھے "ہنس" لینے کا فیصلہ دار دھاکا کی ایک ٹینک میں ہوا تھا جس میں پریم چند کو بھی بلایا گیا تھا۔

مگر پچاس روپے مہینے کی بچت دیکھنے والے بنے "ہنس" کو موتی کہا کھلا سکتے تھے۔ یہ تو پریم چند کی کابلوتہ تھا۔ جون ۱۹۳۷ء کے پرچے میں سٹیج گو بند داس کا ایک مضمون شائع ہوا جسے گورنمنٹ نے قابل اعتراض سمجھا اور مہنس سے ضمانت مانگ کی۔ پریشد نے ضمانت دینے سے انکار کر کے پرچہ بند کرنے کا اعلان کر دیا۔ پریم چند اس وقت بیمار تھے۔ انھیں پریشد کا یہ بیانیہ بہت ناگوار معلوم ہوا۔ انھوں نے فوراً ضمانت داخل کرائی اور پرچہ اپنی ملکیت میں لے کر جاری رکھا۔

اس سے پہلے بھی گورنمنٹ نے "ہنس" پر کئی حملے کئے تھے۔ اس کی سزا کے چھ ماہ بعد ہی جون ۱۹۳۷ء میں پہلی ضمانت مانگی گئی تھی جس کی وجہ سے پرچہ بند ہو گیا۔ لیکن جنوری ۱۹۳۸ء میں آرڈیننس ختم ہو گیا تو پھر جاری کر دیا مگر دوسری تین نمبر تکھے تھے کہ پریم چند کی "قاتل" کہانی کی اشاعت کی بنا پر ضمانت مانگی گئی، لیکن بنارس کے حکاکٹر کی سفارش پر حکومت نے اپنا حکم واپس لے لیا۔ اور "ہنس" بدستور چلتا رہا۔

پریم چند نے ہر قیمت پر "ہنس" کو قائم رکھنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ مرتے دم بھی اگر انھیں کوئی فکر تھی تو یہی کہ میرے بعد "ہنس" کیسے زندہ رہے گا وہ اسے اپنے بیٹے کی طرح پیار کرتے تھے "ہنس" اور "جاگرن" کو زندہ

رکھنے کے لئے انھیں ستمبر ۱۹۳۷ء میں فلم کی ملازمت قبول کرنا پڑی تھی ان کے بعد سسوانی دیوی نے اور ان کے لڑکے امرت رائے نے ہنس کو بدستور زندہ رکھا ہے اور ہنس "پریم چند کی ترقی پسند دواؤں کا علمبردار ہے، جس کی وجہ سے ہاتھکوں کو اس کے ساتھ دلی انس پیدا ہو گیا ہے بانی مشکلات کے باعث امرت رائے نے دسمبر ۱۹۳۷ء میں ہنس کو چھ ماہ کے لئے بند رکھنے کا اعلان کیا تو ہاتھکوں نے اس فیصلے کی زبردست مخالفت کی اور پرنٹسٹ کے خط لکھے۔ پٹنہ کے ایک ہاتھک کا خط ملاحظہ ہو:-

"میں ایک عرصے سے ہنس کا ہاتھک رہا ہوں۔ ہنس جو بیتی برتنا ہاتھک اس کا میں قائل ہوں ہنس "کانگریس ڈھنگ سے جنتا کی سیوا کرنے کا ڈھنگ نہیں کرتا رہا ہے۔ اس نے طبقہ داری تقسیم کو سمجھا ہے اور جنتا کی سیوا کرنے کی اس میں سچی لگن ہے۔ آج جب ہمیں رجعت پرستی پر، جو ہمارے چاروں طرف موجود ہے اور جو اپنا غریبی پنچہ اور مضبوط کرنا چاہتی ہے چاروں طرف حملہ کرتا ہے ہنس رجعت پرستی کے حلقے کو توڑنے کے لئے ہمارے ہاتھ میں ایک بہت ہی مضبوط ہتھیار ہے۔"

اس ہتھیار کے کی ضرورت سے گھبرا کر دیلی کانگریس سرکار نے مئی ۱۹۳۹ء میں ہنس کے ایڈیٹر امرت رائے کو ایک نوٹس دیا جس میں ہنس پر فرقہ داری اور اشتعال انگیزی کا الزام لگا کر پرچے کو بند کرنے کی جھکی دی تھی۔ ہندی اور اردو کے تمام سنجیدہ اور انسان دوست ادیبوں اور ایڈیٹروں نے کانگریس سرکار کے اس فعل کی مذمت کی اور ہنس "کو

اس جسے محفوظ رکھا۔

اس کے باوجود خانگی جھگڑوں کے باعث "ہنس" چھ ماہ سے بند ہے معلوم ہوا ہے کہ اب امرت رائے نے بڑے بھائی شری پت رائے سے بیواہ کر کے اپنے عرصے کا پرلین الگ لگا لیا ہے۔ "ہنس" اس پرلین پر پھر چھپنے لگے گا۔

امرت رائے ہی نقصان کے باوجود پہلے چلا رہے تھے اور اب بھی چلا رہے گئے، کیونکہ طبقاتی جدوجہد کے اس زمانے میں "ہنس" کی سخت ضرورت ہے۔ پریم چند نے جس منزل کی طرف اشارہ کیا تھا امرت رائے بڑی سستھی ہے اس کی طرف بڑھ رہے ہیں "ہنس" ان کے اور دوسرے ادیبوں کے ہاتھ میں ہتھوڑا ہے جس سے وہ رائے کی چٹانوں کو توڑ سکتے ہیں۔ راہ یہ ہے جو پریم نے اپنے بورڈر واکچر (ماہاجی تہذیب) مضمون میں دکھائی تھی۔

"اس کلچر نے سماج کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے۔ جن میں ایک ہڑپے والا ہے، دوسرا ہڑپا جانے والا ہے۔ اس بورڈر واکچر کا خاتمہ ہوا کہ صرف روس میں اور جو سماجی نظام اس ملک کے لئے فائدہ مند ثابت ہوا ہی وہ ہندوستان کے لئے بھی ہو سکتا ہے۔"

سمریاترا

اگر آدمی جدوجہد سے گھبرائے تو

بزدل ہے (پریم چند)
 پریم چند نے "سوز و غم" سلسلہء نثر میں لکھی تھی۔ اس وقت ملک میں تقسیم ہند کی تحریک چل رہی تھی۔ اس کتاب کا مقصد اس تحریک کو آگے بڑھانا اور ہم وطنوں کے دلوں میں حب الوطنی کے جذبے کو تقویت دینا تھا۔ حکومت نے اسے ضبط کر لیا تھا اس کتاب کے بائیس تیس سال بعد انھوں نے کہانیوں کی ایک کتاب پھر لکھی جس کا نام "سمریاترا" تھا اس وقت ملک میں عدم تعاون کی تحریک چل رہی تھی۔ اس کتاب کا مقصد اس تحریک کو آگے بڑھانا اور آزادی کی جدوجہد کو تیز کرنا تھا۔ اس کتاب کو بھی حکومت

نے ضبط کر لیا۔

۱۹۱۷ء میں آزادی اور دیس بھگتی ایک روحانی تصور تھا۔ آدمی کے دل میں یہ جذبہ اس لئے پیدا ہونا چاہئے کہ اسے ہیرو بننا ہے اپنی ذات کو بلند کرنا ہے۔ جس کے دل میں یہ جذبہ نہیں ہے وہ انسان کہلانے کا ہی مستحق نہیں ہے۔ آزادی یعنی سوراخ اس کا پیدائشی حق ہے۔ بس ایسی ہی باتوں اور نعروں پر اس جذبے کی بنیاد قائم تھی۔ یہ جذبہ میزبینی اور گیرمی بالڈی وغیرہ دوسرے ملکوں کے دیس بھگتوں سے مستعار لیا جاسکتا تھا جیسا کہ پیریم چند نے سوز وطن کی کہانیوں کی طرح جذباتی انداز سے اس وقت میزبینی اور گیرمی بالڈی وغیرہ کے سوانح حیات بھی لکھے تھے۔ تحریک آزادی کے اقتصادی پہلوؤں پر بالکل غور نہیں کیا جاتا تھا جس طرح آزادی کا حب الوطنی کا یہ ہوا محض تصور ناقص ہے اسی طرح وہ کہانیاں بھی خام تھیں۔

لیکن ۱۹۳۰ء تک ہماری جنگ آزادی بہت سی منزلیں طے کر چکی تھی وہ صرف بحث کرنے والے وکیلوں، برطانیہ سے مراعات مانگنے والے تاجروں اور درمیانہ طبقے کی تحریک نہیں رہی تھی۔ اقتصادی سنگٹ محنت کش عوام کی کمر توڑ رہا تھا۔ کسان مزدور آزادی کی تحریک میں کھینچے چلے آئے تھے دنیا میں بڑی بڑی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں، روس کا مزدور انقلاب بورژوا طبقہ کی تمام مزاحمت کو ختم کر کے دنیا بھر سے مزدور اور محنت کش طبقے کی لافانی عظمت کا لوہا منوا چکا تھا، ادب اب روس پنج سالہ اقتصادی

منصوبہ بنا کر خوش حالی کی طرف بڑھ رہا تھا، دنیا بھر کے پڑھے لکھے نوجوان ان انسان دوست دانش ور روس کے نئے نظام سے متاثر ہوئے تھے۔ ہمارے دیس میں بھی گرم دل نوجوانوں کی پارٹیاں بن رہی تھیں۔

پریم چند تو پہلے ہی اس انقلاب کا سواگت کر چکے تھے۔ اب مزدوروں کسٹوں کی کامیابیاں دیکھتے تو اور بھی خوش ہوتے تھے اور اپنے ملک میں حکمران اور سرمایہ دار طبقے کی لوٹ کھسوٹ ختم کرنے کے لئے روسی طرز کے نظام حکومت کی تائید کرتے تھے۔

غالباً نومبر ۱۹۱۷ء کی بات ہے۔ پریم چند لکھنؤ میں تھے۔ واکسراہ وہاں آیا، یورپی کے زمینداروں نے اس کا خوب استقبال کیا اور اس کی آمد کی خوشی میں رات کو چالیس ہزار روپے کی آتش بازی جلانے کا انتظام تھا۔ پریم چند نے گھر جا کر ذکر کیا تو شورانی بولیں کہ ہم نے تو اتنی بڑی آتش بازی کبھی نہیں دیکھی کیا آپ دیکھنے چلیں گے؟

پریم چند بولے : ہاں کیوں نہیں چلوں گا۔ غریبوں کا گھر بھونک تماشہ دیکھا جائے گا۔

شورانی ویلوی اس وقت نہیں سمجھتی تھیں کہ اس میں غریبوں کا گھر چٹکا ہے ان کا خیال تھا کہ بڑے بڑے زمیندار رائے بہادر اور خان بہادر یہ سارا انتظام کرتے ہیں اور انھی کا پیسہ خرچ ہوتا ہے۔ لیکن پریم چند نے انھیں بتایا کہ دیس میں جو ۸۰ فی صدی گسان اور کچھ دوسرے محنت کش لوگ رہتے ہیں ان کی محنت سے یہ دولت پیدا ہوتی ہے۔ ایک طرف تو محنت

کرنے والوں کو دو چونکی روکھی روٹیاں بھی نہیں ملتی اور دوسری طرف یہ لوگ صرف اس اُمید میں کہ دائرے خطاب دے گا، چالیس چالیس پچاس پچاس ہزار روپیہ آتش بازی میں پھونک دیتے ہیں۔ انگریز اور اُن کے پٹھو ناحق غریبوں کا خون چوستے ہیں۔

اس کے بعد جو بحث شروع ہوتی ہے، اسے شورانی اپنی کتاب ”پریم چند گھر میں“ یوں بیان کرتی ہیں۔

میں بولی :- جب سوراج ہو جائے گا۔ تب کیا چوسنا بند ہو جائے گا۔ آپ بولے :- چوسنا تو تھوڑا بہت ہر جگہ جاتا ہے۔ یہی شاید دنیا کا نیم ہو گیا ہے کہ کم زور کو شہ زور چوسیں، ہاں دوسرے جہاں پر کہ بڑوں کو مار مار کر درست کر دیا گیا، اب وہاں غریبوں کو آندہ ہے۔ شاید یہاں بھی کچھ دنوں کے بعد دوس جیسا ہی ہو۔

میں بولی :- کیا آشا ہے کچھ؟

آپ بولے :- ابھی جلدی اس کی آشا نہیں۔

میں بولی :- مان لو کہ جلدی ہی ہو جائے، تب آپ کس کا ساتھ دیں گے؟ آپ بولے :- مزدوروں اور کاشتکاروں کا۔ میں پہلے ہی سب سے کہہ چلا تھا کہ میں بھی مزدور ہوں، تم بھاڑا چلاتے ہو، میں قلم چلاتا ہوں، ہم دونوں براہِ بری ہیں۔

میں ہنس کر بولی :- اس طرح کہنے سے کام نہیں چلے گا، وہ تمہارا دشواری نہیں کرے گا۔

وہ بولے :- تب تک سب لکھ پڑھ جائیں گے۔ کیا روس میں لیکھک نہیں ہیں؟
 وہاں کے لیکھکوں کی حالت یہاں کے لیکھکوں کی حالت سے کئی گنا اچھی
 ہے۔ میں تو اس دن کے لئے مرتا ہوں کہ یہ دن جلدی آئے۔

میں بولی : تو روس والے یہاں بھی آئیں گے؟
 وہ بولے :- روس والے یہاں نہیں آئیں گے، بلکہ روس والوں کی شکستی ہم لوگوں
 میں آئے گی۔

میں بولی :- وہ لوگ اگر یہاں آتے، تو شاید ہمارا کام جلد ہی ہو جاتا۔
 وہ بولے :- وہ لوگ یہاں نہیں آئیں گے، ہمیں لوگوں میں وہ شکستی آئے
 گی، وہ ہمارے سکھ کا دن ہو گا۔ جب یہاں مزدوروں اور کاشتکاروں
 کا راج ہو گا۔ میرا خیال ہے کہ آدمیوں کی زندگی اور سفا دہنی ہو جائے
 گی۔

میں بولی :- وہ کیسے ہو گا؟
 آپ بولے :- سنو وہ اس طرح ہو گا کہ ابھی ہم کو رات دن محنت کرنے
 پر بھی بھر پیٹ آرام سے روٹیاں نہیں ملتیں۔ رات دن کچھ نہ کچھ
 فکر ہمیشہ رہتی ہے۔

میں بولی :- تو فکر ہم لوگ اپنے آپ ہی تو کرتے ہیں۔ مزدوروں کا راج ہونے
 پر کیا ہم لوگوں کو فکر دس سے چھٹی مل جائے گی؟
 آپ بولے :- کیوں نہیں چھٹی ملے گی؟ ہم کو آج معلوم ہو جائے کہ ہمارے
 مرنے کے بعد بھی ہمارے بیوی بچوں کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی، اور اس

کی ذمہ داری ہمارے سر پر نہیں بلکہ راشٹر کے سر پر ہے۔ تو ہمارا کیا سر بھر گیا ہے کہ ہم اپنی جان کھپا کر دن رات محنت کریں اور آمدنی کا کچھ نہ کچھ حصہ کاٹ کر اپنے پاس جمع کرنے کی کوشش کریں؟ ہم کو آج معلوم ہو جائے کہ ہمارے مرنے کے بعد ہمارے بال بچوں کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے گی۔ تو ایسا کون آدمی ہے کہ آرام سے کھانا پیننا نہیں چاہے گا۔

ظاہر ہے کہ پریم چند کے دل میں انسان کے عظیم مستقبل کا یقین ^{طرح} برپا تھا اور اُن کے ذہن میں آزادی کا صحیح اور واضح تصور پیدا ہو گیا تھا اب وہ اسی آزادی کے لئے لکھ رہے تھے اور جدوجہد کر رہے تھے۔ پنڈت بنارسہی داس چتر ویدی ایڈیٹر دشال بھارت نے اُن سے دریافت کیا تھا کہ آپ کی تمنائیں کیا ہیں؟ اس کے جواب میں اُنھوں نے جون ۱۹۳۱ء میں لکھا تھا کہ :-

”میری تمنائیں بہت محدود ہیں۔ اس وقت سب سے بڑی آرزو یہی ہے کہ ہم اپنی جنگِ آزادی میں کامیاب ہوں۔ میں دولت اور شہرت کا خواہش مند نہیں ہوں۔ کھانے کو مل جاتا ہے۔ موٹر اور بنگلے کی مجھے ہوس نہیں۔ ہاں، یہ ضرور چاہتا ہوں کہ دو چار بلند پایہ تصنیفیں چھپ کر جاؤں، لیکن اُن کا مقصد بھی حصولِ آزادی ہی ہو۔..... میں بے حرکت زندگی کو بھی ناپسند کرتا ہوں۔ ادب اور وطن کی خدمت کا مجھے ہمیشہ سے دھیان ہے۔

”سُونے روپے سے لدا ہوا آدمی کسی بھی حیثیت سے بڑا نہیں ہوتا۔ دولت مند آدمی کو دیکھتے ہی آرٹ اور علم کے متعلق اس کے بلند بانگ بڑبولوں کو میں دوسرے کان سے نکال دیتا ہوں۔ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس شخص نے اس سماجی نظام کی تائید کی ہے جو امیروں کے ہاتھوں غریبوں کی خون آشامی پر قائم ہے۔ ایسا کوئی بڑا نام مجھے متاثر نہیں کر سکتا جو دولت کا بیماری ہو۔ ممکن ہے کہ میری ناکام زندگی نے میرے جذبات کو اتنا تلخ بنا دیا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ بنک میں کوئی مولیٰ رقم جمع کرنے کے بعد شائد میں بھی ان جیسا ہند جاتا اور لالچ کا مقابلہ نہ کر سکتا۔ لیکن مجھے فخر ہے کہ فطرت اور قسمت نے میری مدد کی اور مجھے غریبوں کا شریک غم بنا دیا۔ اس سے مجھے روحانی تسکین ملتی ہے“

”جب نان کو پرنسپل کے آخری دنوں میں سوراخ پارٹی قائم ہوئی تو ۱۸ فروری ۱۹۲۵ء کو ایڈیٹر زمانہ کے نام ایک خط میں لکھا: ”آپ نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں کس پارٹی کے ساتھ ہوں۔ میں کسی پارٹی میں نہیں ہوں۔ اس لئے کہ اس وقت دونوں میں کوئی پارٹی عملی کام نہیں کر رہی ہے میں اس آئے دالی پارٹی کا ممبر ہوں، جو عوام الناس کی سیاسی تعلیم کو اپنا دستور العمل بنائے گی.....“

ان سب باتوں سے ظاہر ہے کہ ان کی زبردست خواہش تھی کہ عوام ابھریں۔ جب یہ دیکھتے تھے کہ اپنے ہی ملک کے پڑھے لکھے لوگ اور سرمایہ دار طبقہ انھیں جاہل بنا کر لوٹ رہا ہے تو وہ اس کے

مقابلے میں عوام کی حمایت کرتے تھے اور ہر طرح کی لوٹ کھسوٹ ختم کرنا چاہتے تھے۔ امیر طبقے کی خود غرضی دیکھ کر انھیں یقین ہوتا جا رہا تھا کہ یہ آزادی کی جدوجہد بھی عوام ہی لڑیں گے۔ اس لڑائی میں امیر طبقہ کبھی عوام کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ وہ ان سے دھوکا کرے گا۔ ”زنگ بھومی“ (چمکا ہستی) میں لنور بھرت سنگھ جب جائداد کے موہ میں متحرک سے غمراہی کر گئے تو پریم چند لکھتے ہیں کہ صاحب جائداد کبھی آزادی کی جنگ نہیں لڑ سکتے جو سپاہی سونے کی اینٹ گلے میں باندھ کر میدان جنگ میں لائے گا وہ کیا خاک لڑے گا اُسے تو اپنی اینٹ ہی کا خیال رہے گا۔“

تحریک آزادی کا یہ نیا تصور تھا جو ”سوزِ وطن“ کی حب الوطنی سے بالکل مختلف تھا۔ اس جذبے کی محرک عوام کی لوٹ کھسوٹ اور بے کسی تھی اور انھی کو اپنی سیاسی مشکلات کا حل کرنے کے لئے یہ جنگ لڑنی تھی اور سوراج کا مطلب تھا لوٹ کھسوٹ اور ظلم کو ختم کرنا ”سمریاترا“ کی کہانیوں کو دیکھا جائے تو آزادی کا یہ تصور بہت ہی واضح صورت میں ابھر کر رہائے سامنے آتا ہے۔

اس مجموعے کی ایک کہانی ”آشیاں برباد“ تھی۔ اس کہانی میں مرد لا اور چھادیوی دو عورتیں ہیں جو عدم تعاون کی تحریک میں جیل جاتی ہیں، چھادیوی پہلے جیل میں ہے اور مرد لا دیوی بعد میں آکر اُسے باہر کے حالات سناتی ہے۔

”اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی بھیس

باہر کی خبریں کیا معلوم ہوں گی۔ پرسوں شہر میں گولیاں چلیں۔ دیہاتوں میں
 آج کل لگان وصول کیا جا رہا ہے۔ کسانوں کے پاس روپیہ ہے نہیں غلہ
 ارزاں ہو گیا ہے اور دن بدن گرتا جا رہا ہے۔ پونے دو روپے میں من بھر
 گیہوں آتے ہیں۔ میری عمر سی کیا ہے۔ اماں بھی کہتی ہیں غلہ اتنا سستا
 پہلے کبھی نہ تھا۔ کھیتوں کی پیداوار سے بچوں کے دام تک نہیں آتے۔ سچائی
 اور محنت سب اوپر غریب کہاں سے دیں۔ سرکار کا حکم ہے کہ جیسے بھی ہو
 لگان وصول کیا جائے۔ کسان اس پر راضی ہیں کہ ہمارے مال اسباب
 قرق کرو، اپنی زمین لے لو۔ مگر یہاں تو حاکموں کو اپنی کارگزاری دکھانے کی
 فکر ملتی ہوئی ہے۔ زمینداروں نے کہہ دیا ہم سے وصول نہیں ہوگا۔ اب پولیس
 بھیجی گئی ہے۔ بھیروں گنج کا علاقہ پیا جا رہا ہے۔“

اس دور کے اقتصادی سنکٹ کی پوری تصویر ہے۔ جب اناج کو ٹریلوں
 کے بھار بکتا تھا تو کسان لگان کہاں سے دیتے؟ اور ادھر کسا دبازاری کے
 مارے دوکان دار اور درمیانہ طبقے کی کمر ٹوٹ رہی تھی، بے کاری میں روز
 بروز اضافہ ہو رہا تھا جس سے ملک میں بے چینی بڑھ رہی تھی۔ لاوا ابلتا ہو
 تو بھونچال آتا ہو، جمود ٹوٹتا ہے۔ ملک میں بھوک کا لاوا ابل رہا تھا اور قحط
 پسند طبقے کا سنگھاسن ڈول رہا تھا۔

انہی حالات میں گاندھی نے نمک تحریک شروع کی تھی اور ڈانڈی
 کو مارچ کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ میں لوٹوں گا تو آنا دی لے کر درنہ
 میری لاش سمندر میں تیرتی نظر آئے گی۔

لوگوں نے اس بات کو سچ سمجھا اور سارا دس حرکت میں آ گیا۔ نمک کا قانون توڑا جلنے لگا۔ دلائی گپڑے جلانے جلنے لگے۔ بدیشی کپڑے اور شراب کی دکانوں پر پکٹنگ ہونے لگی اور جلیں بھری جلنے لگیں۔ پریم چند بھی جیل جانے کو بے قرار تھے، لیکن ان سے پہلے شورانی دیوی چلی گئیں۔ اب اگر پریم چند بھی جائیں تو کچھ بچوں کو کون سنبھالے گھر کا کیلئے؟ اس لئے جیل جلنے کی حسرت دل میں رہ گئی۔

ان کے دل میں جنگ آزادی میں شامل ہونے کا جاذبہ دست جذبہ تھا اس کا اظہار انھوں نے "سمر پاترا" کی کہانیوں میں کیا۔ اگرچہ یہ جنگ آزادی بھی گاندھی کی قیادت میں اور اہنساکے اصولوں پر کاربند رہتے ہوئے لڑی جا رہی تھی اور پریم چند گاندھی کی لیڈر شپ کو قبول کرتے تھے۔ لیکن حیرت کی بات یہ کہ ان کہانیوں میں گاندھی ازم سے زبردست اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ پریم چند کے ذہن میں شبہ ہی نہیں بلکہ پورا یقین تھا کہ صرف اہنساکے اور محض جلوس نکالی کر آزادی نہیں آئے گی۔ اس بات کی دلیل "قافل" کہانی ہے۔ اس میں ماں بیٹے کا مکالمہ سنئے۔ ماں ستیاگرہ کی قائل اور بیٹا دہشت پسند ہے۔ پریم چند لکھتے ہیں :-

دھرم دیر :- مجھے امید نہیں کہ پکٹنگ اور جلوسوں سے ہمیں آزادی حاصل

ہو سکے یہ اپنی کمزوری اور معذوری کا صریحی اعلان ہے۔ جھنڈیاں

نکال کر اور گیت گاکر قومیں آزاد نہیں ہوا کرتیں..... مجھے تو

یہ طرز عمل بچوں کا سا کھیل معلوم ہوتا ہے۔ لڑکوں کو رونے دھونے

سے مٹھائیاں ملا کرتی ہیں۔ وہی ان لوگوں کو مل جلے گا۔ اصلی آزادی
جھمی ملے گی جب ہم اس کی قیمت دینے کو تیار ہوں گے۔

ماں :- اس کی قیمت کیا ہم نہیں دے رہے ہیں، ہمارے لاکھوں آدمی جیل
نہیں گئے؟ ہم نے ڈنڈے نہیں کھائے؟ ہم نے اپنی جائدادیں نہیں
صنط کرائیں؟

دھرم دیر :- اس سے انگریزوں کا کیا نقصان ہوا۔ وہ ہندوستان
اس وقت چھوڑیں گے۔ جب انھیں یقین ہو جائے گا کہ اب ہم یہاں
ایک لمحہ بھر بھی زندہ نہیں رہ سکتے۔ اگر آج ہندوستان کے ایک نڈر
انگریز قتل کر دئے جائیں تو آج سو راج مل جائے۔ روس اس طرح
آزاد ہوا۔ آئرلینڈ اس طرح آزاد ہوا اور ہندوستان بھی اسی طرح
آزاد ہوگا۔.....

اس کہانی کی بنا پر سلسلہء عیش ہنس سے ضمانت طلب کی گئی تھی
پریم چند اس بات کو بھی نہیں مانتے کہ لاکھیاں اور گولیاں کھاتے
جاؤ۔ آخر انگریز کا دل پیچ جائے گا اور وہ حکومت انھیں سونپ کر چلے
جائیں گے۔

”آشیاں برباد“ کہانی میں پہلے دن جلوس نکلتا ہے۔ گولیاں چلتی
ہیں۔ بہت سے آدمی ہلاک ہوتے ہیں۔ جلوس دوسرے دن پھر نکلتا ہے
پریم چند اس کی تائید میں لکھتے ہیں۔
لوگ کہتے ہیں۔ جلوس نکالنے سے کیا ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا

ہے ہم زندہ ہیں۔ مستعد ہیں۔ میدان سے ہٹے نہیں۔ ہمیں اپنی بار نہ ملنے والی خودداری کا ثبوت دینا ہے۔ یہ دکھا دینا ہے کہ ہم تشدد سے اپنے مطالبہ آزادی سے دست بردار ہو جانے والے نہیں۔ ہم اس نظام کو بدل دینا چاہتے ہیں جس کی بنیاد ظلم اور خود غرضی اور خون چوسنے پر رکھی گئی ہے۔

”اور پولیس نے جلوس کو روک کر اپنی زندگی اور قوت کا ثبوت دینا بھی ضروری سمجھا۔ شاید ملک کو دھوکا ہو گیا ہو کہ کل کے واقعہ سے سرکار میں احساس اخلاق پیدا ہو گیا ہے اور وہ اپنی حرکت پر نادم ہے۔ پبلک کے اس دہم کو دور کرنا اس نے اپنا فرص سمجھا۔ وہ یہ دکھانا چاہتی تھی کہ ہم تمہارے اوپر حکومت کرنے آئے ہیں اور حکومت کریں گے۔“

انھیں کانگریس لیڈروں کی پالیسی کی تہہ میں سمجھو نہ بازی بھی نظر آنے لگی تھی اور انھیں شک ہو گیا تھا کہ ان کے لائے جو سوراج آئے گا اس میں بھی لوٹ کھسوٹ جاری رہے گی۔ ان کی جیل کہانی کی ہیروئن ایک سمجھدار لڑکی کانگریس کی اس بورڈر سیاست کے خلاف احتجاج کرتی ہے۔

”اگر سوراج آنے پر بھی جائداد کی ہی حکمرانی رہے اور تعلیم یافتہ طبقہ یوں ہی خود غرض بنا رہے تو میں کہوں گی ایسے سوراج کا نہ آنا ہی اچھا ہے۔ انگریزی مہاجنوں کی ہوس زرا اور تعلیم یافتہ طبقہ کی خود پروری آج ہمیں پیسے ڈال رہی ہے۔ جن برائیوں کو دور کرنے کے لئے آج ہم جان ہتھیلی پر لئے ہوئے ہیں۔ انھیں برائیوں کو پر جا کیا اس لئے سر چڑھائے گی کہ وہ بدیشی نہیں سودیشی ہیں۔ کم از کم میرے لئے تو سوراج کا یہ مطلب نہیں

ہے کہ جان کی جگہ گوبند بیٹھ جائے؟

یہ پیش گوئی تھی "سرمایہ" کی کہانیوں سے صرف انگریز حکومت پر سہی نہیں۔ سرمایہ دار طبقہ اور کانگریس کی بورژوا سیاست پر بھی زبردست چوڑی پڑتی ہے۔ انگریز حکومت نے سمجھ لیا تھا کہ گاندھی کی نمک تحریک سے یہ کتنا زیادہ خطرناک ہے۔ اس لئے اسے ضبط کر لیا گیا۔

ناڈل "میدانِ عمل" بھی اسی تحریک سے متعلق ہے اور انھیں دونوں لکھا گیا ہے۔ مگر اس پر گاندھی ازم کی چھاپ بہت گہری ہے۔ ساری تحریک کی رہنمائی اور نچا طبقہ کے لوگ کرتے ہیں اور اسنادِ دادی دھنگ سے کرتے ہیں۔ پھر حیرت یہ ہے کہ غلامت کے پتے چوری کا مال کھانے والے سمکانت اور دھنی رام جیسے سیٹھوں کا تالیفِ قلب بھی ہو جاتا ہے۔ شاید پریم چند کی یہی تک اس طبقہ سے کچھ اُمیدیں وابستہ تھیں، شاید انھیں گاندھی کے فلسفہ کی تائید کرنا مقصود تھا درندہ اسی ناڈل میں لکھتے ہیں:-

"سرمایہ ہی تو دنیا میں ہر قسم کی غلامی کو قائم رکھے ہوئے ہے"

فلم

دل کو سمجھانے کے لئے دلائل

کی کمی نہیں ہوتی۔ دنیا میں انسان

ترین کام خود کو دھوکا دینا ہی (پریم چند)

ایک مرتبہ پریم چند دران کی بیوی ڈیوڑھے درجے میں سفر کر رہے تھے
آج کل کی طرح ان دنوں بھی گاڑیوں میں بڑی بھیسٹر رہتی تھی۔ بہت سے کسان
اُن کے دبے میں گھس آئے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ شیتلا دیوی کے
درشن کرنے گئے تھے اور ایک ایک آدمی کے کم سے کم پندرہ روپے خرچ ہوئے
تھے کسان کے لئے ان دنوں پندرہ روپے بڑی بات تھی۔

پریم چند سمجھانے لگے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ تم لوگوں نے چار چار
ہینے کے کھانے کا غلہ بیچ دیا۔ اس سے اچھا ہوتا کہ دیوی جی کی پوجا تم

لوگ گھر پر ہی کر لیتے۔ دیوی دیوتا بھی خوش ہوتے ہیں جب تم آرام سے رہو
شورانی دیوی جاہتی تھیں کہ کسان کسی طرح تیسرے درجے کے ڈبے
میں چلے جائیں کیونکہ وہاں بھیڑ زیادہ ہو گئی تھی۔ وہ بولیں، "پھر سمجھالینا
میرا تو دم گھٹا جا رہا ہے"

پریم چند نے جواب دیا۔ "انھی کے لئے جیل جاتی ہو، لڑائی لڑتی
ہو، اور انھی کو ہٹا رہی ہو، مجھے تو ان غریبوں پر رحم آ رہا ہے، بے چارے
بھوکوں دھرم کے پیچھے مر رہے ہیں۔"

شورانی :- تو گاڑی میں بیٹھے نہیں سیکھ جائیں گے ؟
پریم چند :- آخر تب کب سمجھایا جائے ؟

شورانی :- آپ انھی کے لئے تو بدلتا کا پوتھا لکھ رہے ہیں۔
پریم چند :- یہ کتابیں لے کر تھوڑا ہی پڑھتے ہیں۔ ہاں میرے نادلوں کے فلم تیار کر کے
گاؤں گاؤں مفت دکھائے جاتے، تو لوگ دیکھتے۔"

یہ سلسلہ کار کا واقعہ تھا، اس کے بعد سلسلہ میں بھی کی اجتناب سے
فلم کمپنی نے انھیں بلایا۔ پریم چند نے اس موقع کو غنیمت سمجھا، بھیجے جانے کے
لئے تیار ہو گئے، کیونکہ اس سے معقول آمدنی کی توقع تھی۔ "منس" اور "جاگرن"
دو پرچے نکل رہے تھے۔ اخراجات بڑھے ہوئے تھے۔ انھیں چلانا مشکل
ہو رہا تھا۔ شورانی دیوی سے مشورہ کیا تو انھوں نے منع کر دیا۔

آپ بولے :- تمہیں سوچنا پڑا جائے کام بھی تو نہیں چل سکتا، یہاں جو کچھ آمدنی
ہوتی ہے، اپنے پر خرچ ہو جاتی ہے، یہ "منس" اور "جاگرن" کیسے چلیں ؟

شورانی :- تو پھر ان کے لئے بھی میں بہی جانا ٹھیک نہیں سمجھتی ۔
 وہ بولے :- اب جہان ہاتھیوں کو گلے سے باندھا ہے تو کیا ان کو چارہ نہیں
 ددی ؟ آخر ان کو بھی تو زندہ رکھنا ہے ۔

شورانی :- آپ جو بھی کام کرنے ہیں ، جان کی مصیبت مول لے لیتے ہیں ۔
 وہ بولے :- ارے صاحب ان باتوں کا رونا تو بچا سوں بار ہو چکا ہے ، اب
 جب ان کو باندھ لیا ہے تو ان کو چلانا ہی ہوگا ، اور ایک بات بتانا
 ہوں ، جو وہاں جانے کا خاص فائدہ ہوگا وہ یہ کہ نادل اور کہانیاں
 لکھنے میں جو فائدہ نہیں ہو رہا ، اس سے کہیں زیادہ فلم دکھا کر ہو سکتا
 ہے ، کہانیاں اور نادل جو لوگ پڑھیں گے وہ تو ان سے فائدہ اٹھا سکیں
 گے ۔ فلم سے ہر جگہ کے لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں ۔

شورانی :- لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں ، مجھے کیا فائدہ ہوگا ؟
 پریم چند :- یہی تو تمہاری غلطی ہے ۔ لوگوں کے فائدے کے لئے میں تھوڑے
 ہی لکھتا ہوں ؟ اپنی روح کی تسکین کے لئے جو کچھ لکھتا ہوں ، اسے
 جتنے ہی لوگ تعداد میں زیادہ سمجھ سکیں ، دیکھ سکیں ، پڑھ سکیں ، اتنا
 ہی مجھے زیادہ تسکین ملے گی ، اور اس کے بعد دوسرا فائدہ یہ ہوگا
 کہ "تہنس" ، "جاگرن" کے چلانے کے لئے میں زیادہ روپیہ دے سکوں گا
 تو ہزار روپے سال وہ دینے کا وعدہ کرتے ہیں ۔ اور اس کے ساتھ
 یہ بھی ہے کہ بہی میں ایک سال رہنے کے بعد وہ مجھے دس ہزار
 گھر بیٹھے دیں گے ۔....."

اس امید میں وہ بھی چلے گئے اور داد میں ایک مکان کرائے پر کے رہنے لگے۔ وہاں سے ۱۰ جولائی ۱۹۳۷ء کو ایڈیٹر زمانہ کے نام ایک خط لکھا :-

"میں یکم جون کو بھی چلا آیا۔ اس کمپنی سے ایک معاہدہ کر لیا ہے۔ سالانہ میں چھ قسطے اُسے دینا ہوں گے۔ رسالوں سے متواتر نقصان ہو رہا تھا۔ ایک سیلہ دس سے روپے وصول نہ ہوتے تھے۔ کاغذ وغیرہ کا بار بڑھتا جاتا تھا۔ مجبور ہو کر میں نے یہ معاہدہ کر لیا۔ چھ قسطے لکھنا مشکل نہیں، ۱۸ ڈاکٹر مل کے مشورے سے لکھنا ضروری ہے، کیا جیفر فلم کے لئے موزوں ہوگی اس کا بہترین فیصلہ وہی کر سکتے ہیں....."

پریم چند کو اس وقت کاغذ کے لئے لگ بھگ دو ہزار روپے کے قریب جمع کرنے تھے۔ بھی جانے سے پہلے جنرل کمار جین کے نام ایک خط میں اپنی مالی مشکلات کا ذکر کیا تھا، لکھتے ہیں :-

"بھئی کی ایک فلم کمپنی مجھے بلا رہی ہے، تنخواہ کی بات نہیں ٹھیکے کی بات ہے۔ اٹھ ہزار روپے سالانہ پر۔ اب میں اس حالت پر پہنچ گیا ہوں جب مجھے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا ہے کہ یا تو وہاں چلا جاؤں یا اپنے نادول کو بازار میں بیچوں..... کمپنی والے حاضری کی قید نہیں رکھتے۔ میں جو چاہوں لکھوں، جہاں چاہے چلا جاؤں۔ وہاں سال بھر رہنے کے بعد ایسا کنٹریکٹ کر لوں گا۔ یہیں (بنارس میں) بیٹھے بیٹھے میں چار کہانیاں لکھ دیا کروں گا، اور چار پانچ ہزار روپے مل جایا کریں گے۔"

جن سے جاگرن "اور سنس" دونوں مزے میں چلیں گے، اور پیسے کی تکلیف جاتی رہے گی۔

ان دنوں بے کاری اور کساد بازاری خوب پھیل رہی تھی جس کی وجہ سے مزدوروں اور مل مالکوں میں ٹکڑ ہو رہی تھی۔ پریم چند وقت کے اس اہم مسئلے سے کیسے غافل رہ سکتے تھے اور مزدوروں تک اپنا پیغام پہنچانے کے لئے فلم بڑا اچھا وسیلہ تھی چنانچہ پریم چند نے اپنی پہلی کہانی تل مزدور لکھی۔

لکھنے کے بعد یہ کہانی فلم کی شکل میں کیسے تیار ہوئی۔ اس کی بابت ایک صاحبِ ملت کمار نے لکھا ہے جو پریم چند کی بدولت کمپنی کے ایکٹروں میں بھرتی ہو گئے اور لگ بھگ ہر روزان سے ملتے تھے۔ انھوں نے ایک مضمون تل مزدور فلم کیسے بنی؟ میں لکھا ہے۔

"اس وقت وہ اپنی کہانی تل مزدور ختم کرنے میں مصروف تھے۔ کہانی ختم کرتے ہی انھیں اس کا اردو ترجمہ بھی کرنا پڑا۔ کیونکہ کمپنی کے منیجر ڈاکٹر کٹر، فلم ڈاکٹر کٹر بھوٹانی اور ان کے ساتھی مسٹر خلیل آفتاب سندھی نہ جانتے تھے۔ پھر سینیریوں کی آسانی اور بھوٹانی صاحب کی رائے کے مطابق کہانی میں کئی تبدیلیاں کرنی پڑیں، کچھ نئی باتیں جوڑیں اور کچھ ہٹائی گئیں جو شکل پہلے تجویز کی گئی تھی، اس کے تمام حصے الگ کر دئے گئے اور قصے نئی شکل دی گئی۔ اس سے پلاٹ میں صرف تبدیلی ہی نہیں ہوئی۔ بلکہ کئی جگہ اصل مطلب اور زبان کا کٹاف بھی فوت ہو گیا۔ اس کے بعد شوٹنگ شروع ہوئی۔ تصویر تیار کی جانے لگی اور کئی جگہ پھر تبدیلیاں ہوئیں۔ خیر دن رات

محنت کر کے تین ساڑھے تین مہینے میں فلم تیار ہوئی۔ اس فلم سے کہنی کو بڑی بڑی امیدیں تھیں، کیونکہ اس میں ایک ایسے عام مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی تھی، جس میں دولت مندوں یعنی مل کے مالکوں اور مزدوروں کی کشمکش نمایاں تھی پریم چند کی اس پر جوش تصور پر نے اس مسئلے پر بڑی خوبی سے روشنی ڈالی ہے۔ مالکوں کا ظالمانہ رویہ، ان کی سختی، امن مانا برتاؤ، مزدوروں کی خراب حالت، ان کی بہو بیٹیوں کی غیر محفوظ حالت اور اس کا نتیجہ۔ یہ سب باتیں بڑی صفائی اور قلمیت سے دکھائی گئی ہیں۔

اس فلم میں ایک پنچایت بھی ہے جس کے صدر پریم چند خود ہیں۔ اس پنچایت کا کام مل کے مالکوں اور مزدوروں میں سمجھوتہ کرانا ہے، یعنی اس فلم میں گاندھی داد کی سمجھوتہ بازی موجود ہے، جس کا مقصد طبقوں کی آئینش کو آمیزش میں ڈھانسا ہے جو مل کے مالکوں اور مزدوروں کو مل جل کر رہنے کا اپدیش کرتی ہے۔

لیکن گاندھی ازم کا یہ ہر تال تو پرنتی قبول کرنے کے باوجود پریم چند کی یہ حصصیت ہے کہ وہ ماری حقیقتوں کو نظر انداز نہیں کرتے، وہ مزدوروں کا نون اور محنت کش طبقہ کی جدوجہد کی جڑوں کو ہمیشہ ان کی اقتصادی مشکلات میں ڈھونڈتے ہیں اور اسے بالکل ٹھیک ڈھنگ سے ابھرتے ہوئے دکھاتے ہیں۔

ان کی ایک کہانی ”ڈائل کا قیدی“ ہے جس میں گاندھی کے فلسفے کے

مطابق مل کے مالک سیٹھ کا صرف ہر دیہہ پر یورتن یعنی تالیف قلم ہی نہیں ہوتا بلکہ مسئلہ تنازع کی بھول بھلیاں بھی موجود ہیں جن سے اسی مسئلہ کافی الجھن میں پڑ جاتا ہے ، پھر بھی طبقاتی جدوجہد پوری شدت سے ابھری ہے ۔ پریم چند نے ایک طرف سیٹھ کی منافع خوری اور پاکادی کی تصویر کشی کی ہے اور دوسری طرف مزدوروں کی تحفیف اجرت میں کمی اور اس کے نتیجے کے طور پر ہڑتال اور جدوجہد بڑی خوبی سے نمایاں کی ہے ۔

کہانی کے جدارِ محکمے ملاحظہ ہوں :-
 ”سیٹھ جی تاجر ہیں ، تاجر کا کام منافع حاصل کرنا ہے ۔ جیسے بھی ملے “

”عام اہل ثروت اصحاب کی طرح سیٹھ جی نے بھی ایک مندر بنایا تھا ۔ ٹھا کر جی کی پوجا کے لئے ایک پجاری نوکر رکھ لیا تھا اور روزانہ دھن کیا کرتے تھے رات کو دنیا کے دھندوں سے فارغ ہو کر “

”سیٹھ جی کا شہر نشی مل ممتاز ملوں میں ہے جب سے شہر نشی تحریک شروع ہوئی ہے مال کی کھپت دوئی ہو گئی ہے اور سیٹھ جی نے موقع دیکھ کر قیمتوں میں اضافہ کر دیا ہے ، اور اس کے ساتھ ہی آدمیوں کی مزدوری میں تحفیف کا اعلان کر دیا ہے ۔ کیونکہ غلہ ارزاں ہو گیا ہے اور نصف مزدوری پر کثرت سے آدمی مل رہے ہیں ۔ کاشتکار دیہاتوں سے بھاگے ہوئے بیٹھے آرہے ہیں تحفیف کا اعلان محض پرانے آدمیوں کو برطرف کرنے کا حیلہ ہی “

بھرجب ہڑتال ہوتی ہے تو سیٹھ اور حکومت کی ملی بھگت ملاحظہ ہو۔۔۔

”صبح کا وقت ہے، مل کے احاطہ کے باہر مزدوروں کا ہجوم ہے۔ بھاٹک پر کانٹے کی ٹیلوں کا پہرا۔ مل میں پوری ہڑتال ہے۔ مزدوروں کے سرغنہ نے سیٹھ جی سے بہت کچھ آرزو منت کی مگر سیٹھ جی نہ دے۔ جب سیٹھ جی نہیں مانتے تو مزدوروں کا لیڈر گوپی جو خود ایک مزدور ہے اپنے مزدور ساتھیوں سے مخاطب ہوتا ہے:-

”ہم مر نہیں گے، لیکن ہم خود جان دے کر دوسروں کے لئے راستہ صاف کر دیں گے، تاکہ دوسرے جنس۔ دوستوں زندگی میں ایسے موقع بھی آتے ہیں، جب مرجانا ہی زندگی کی دلیل ہوتی ہے، نئے آدمیوں کی بھرتی شروع ہوگئی ہے۔ آج ہمیں عہد کرنا پڑے گا کہ ہم کسی باہر کے آدمی کو مل پر نہ کھینے دیں گے۔ چاہے ہمارے اوپر لاٹھیاں چلیں، گولیاں برسیں۔ بھائیو.....“

رٹائی بھی ہوتی ہے، خون بھی بہتا ہے اور کہانی اس طرح آگے چلتی ہے۔ فلم کی کہانی بھی اسی طرح آگے چلی ہوگی۔ کٹر بیونت کے باوجود کپنی کو امید تھی کہ فلم مقبول ہوگی، لیکن سینسر کی قبضی نے امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اس بے رحمی سے کانٹ جھانٹ گی کہ فلم کی دھجیاں اُڑا دیا۔ کتنے ہی موثر سین کاٹ دئے اور کئی شقہ کر دئے، فلم کا اصل مقصد زائل اور چہرہ مسخ ہو گیا۔

کمپنی کو از سر نو محنت کر کے کتنی ہی تصویریں دوبارہ لینی پڑیں۔ پھر بھی سنسر کی تسلی نہ ہوئی۔ حکومتِ بمبئی نے اس کی ناشائس بند کر دی البتہ پنجاب میں چونکہ وہاں مل اور مزدور نہیں تھے، یہ فلم کچھ دنوں دکھائی گئی۔ مگر بمبئی گورنمنٹ کی پیروی میں پنجاب حکومت نے بھی اسے جلد بند کر دیا پھر مٹر بھوٹانی نے ڈیڑھ سال کی کوششوں کے بعد غریب مزدور کے نام سے اسے دکھانے کی اجازت حاصل کی، کیونکہ غریب مزدور تو سرمایہ دار کو دیکھ سکتا ہے۔ اس پر رحم کھا سکتا ہے لیکن لڑاکا مزدور دیکھنا اسے پسند نہیں خوف آتا ہے۔

اس بات نے پریم چند کو دل برداشتہ کر دیا وہ جو ارمان لے کر بمبئی آئے تھے پورا نہ ہوا، انھوں نے ایک اور فلم ”نوجیون“ یا شیر دل عورت لکھی ڈائرکٹروں کے رویتے نے انھیں فلم سے بالکل بظن کر دیا۔ انھوں نے ایک دن شورانی سے کہا: یہاں جو کچھ ہے سینما کے مالک لوگوں کے ہاتھوں میں ہے، لیکھک کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ وہ تو ہمیشہ کمانا چاہتے ہیں۔“

اور سال بھر بھی بمبئی آئے نہیں ہوا تھا کہ ۲۰ اپریل ۱۹۳۵ء کو جیندر کے نام لکھا:۔

”میں جن ارادوں سے یہاں آیا تھا ان میں سے ایک بھی پورا ہوتا نظر نہیں آتا۔ یہ پروڈیوسر جس طرح کی کہانیاں بناتے رہے ہیں اس سے جو بھر نہیں ہٹ سکتے۔ رکیکہ مذاق کو یہ لوگ تماشے کی جان سمجھتے ہیں۔“

ان کا عقیدہ اٹکھا ہے۔ راجہ رانی دزیروں کی سازشیں۔ نقلی لڑائیاں
 بوسہ بازی یہی ان کے مقصد ہیں، میں نے سماجی کہانیاں لکھی ہیں جنہیں
 تعلیم یافتہ طبقہ بھی دیکھنا چاہتا ہے لیکن ان کو فلم کرتے وقت شبہ
 ہوتا ہے کہ چلیں یا نہ چلیں، یہ سال تو پورا کرنا ہی ہے۔ قرض دار ہو گیا تھا،
 قرض پٹ جلے گا۔ مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ نادل "گنودان" کے آخری
 صفحات لکھنے کو باقی ہیں۔ ادھر طبیعت ہی نہیں جاتی۔ اپنے پرانے
 اڈے پر جا بیٹھوں، وہاں دولت نہیں ہے۔ مگر سکونِ قلب ضرور ہے
 یہاں تو معلوم ہوتا ہے۔ زندگی برباد کر رہا ہوں۔

صنیاء الدین برنی کے نام ایک خط میں لکھا ہے :- "بہئی میں مجھے
 ہم مذاق آدمی نہیں ملتا۔ اس لئے آپ سے ملنے کا مجھے کتنا شوق ہو سکتا
 ہے، وہ آپ سمجھ سکتے ہیں۔"

بہئی آنے سے پہلے مہاکنتی سینے ٹون کو "بازارِ حسن" فلمانے
 کی اجازت دیدی تھی۔ اس اثناء میں وہ بھی فلم بن کر سامنے آیا تو بہت
 کیفیت ہوئی للٹ کر لکھتے ہیں :- یہ فلم پہلے پہل بہئی کے امپریل سینما
 ہاؤس میں چلائی گئی تو میں موجود تھا۔ بڑی ناامیدی ہوئی۔ پریم چند
 سے ملاقات ہونے پر میں نے اس کی وجہ پوچھی۔ انھوں نے کہا: بھائی
 مجھ سے کتاب کا کاپی رائٹ مانگا گیا، میں نے اُسے دیدیا۔ اب اگر
 فلم بنانے دے اسے اچھی طرح نہ بنا سکیں تو میرا کیا قصور؟
 بہئی میں ان کی صحت بھی اچھی نہ رہتی تھی اور اجنبی سینے ٹون

کی مالی حالت خراب ہو گئی تھی اس لئے انھوں نے سال بھر پورا ہونے سے پہلے ہی بھٹی میں رہنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

بھٹی ٹاکنز کے ڈائریکٹر مسٹر ہنسو رائے نے چاہا کہ وہ ان کی کمپنی سے وابستہ ہو جائیں۔ لیکن پریم چند نے خراب آب و ہوا کا عذر کیا اور کہا کہ بس اب میں بنارس جا کر رہنا چاہتا ہوں۔ جب ان سے کہا گیا کہ بنارس ہی سے افسانے بھیج دیا کریں انھوں نے معذوری کا اظہار کیا اور اپنی جگہ دوسرے آدمی کی سفارش کر دی۔

وہ فلم لائن سے بے دل ہو چکے تھے۔ اب خود فریبی کی گنجائش نہیں تھی۔

صَدَارَت

” ہماری انجمن ادب کی مدعی اور عمل کا

پیغام اور ترانہ بنانے کی مدعی ہے “ (پریم چند)
 یہ الفاظ پریم چند نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی بابت کہے تھے
 جس کا پہلا اجلاس ۱۹۳۳ء میں لکھنؤ میں ہوا تھا اور جس کے دو صدور
 منتخب ہوئے تھے انھوں نے جس والہانہ انداز سے خطبہ صدارت پڑھ
 کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس اجلاس پر انھیں کتنا فخر تھا، اور انجمن سے
 انھیں کیا کیا امیدیں وابستہ تھیں۔ لکھتے ہیں:-
 ” حضرات یہ جلسہ ہمارے ادب کی تاریخ میں ایک یادگار واقعہ ہے، ہمارے
 سہیلوں اور انجمنوں میں اب تک عام طور پر زبان اور اس کی اشاعت
 سے بحث کی جاتی رہی ہے، یہاں تک کہ اردو اور ہندی کا جو لٹریچر موجود

ہے اس کا منشاء خیالات اور جذبات پر اثر ڈالنا نہیں بلکہ محض زبان کی تعمیر تھا، وہ بھی نہایت ہی اہم کام ہے۔ جب تک زبان ایک مستقل صورت اختیار نہ کرے اس میں خیالات اور جذبات ادا کرنے کی طاقت کہاں سے آئے۔ ہماری زبان کے بانیوں نے ہندوستانی زبان کی تعمیر کر کے قوم پر جو احسان کیا ہے اس کے لئے ہم ان کے مشکور نہ ہوں تو ہماری احسان فراموشی ہوگی، لیکن زبان ذریعہ ہے منزل نہیں۔ اب ہماری زبان نے وہ حیثیت اختیار کر لی ہے کہ ہم زبان سے گذر کر اس کے معنی کی طرف متوجہ ہوں۔ اور اس پر غور کریں کہ جس منشاء سے یہ تعمیر شروع کی گئی تھی وہ کیوں کر پورا ہو۔ وہی زبان جس میں ابتداً باغ و بہار اور بیتال پھسی کی تصنیف ہی معراج کمال تھی۔ اور اب اس قابل ہو گئی ہے کہ علم و حکمت کے مسائل بھی ادا کرے۔“

غالباً ۱۹۱۲ء کی بات ہے کہ پریم چند اور دیانارائن نغم بہت دلوں سے ہندوستانی اکیڈمی کھلوانے کی فکر میں تھے، آخر ہندوستانی اکیڈمی کھلی تو پریم چند اس کے سرگرم کارکن تھے۔ اس کی میٹنگوں سے لوٹنے کے بعد شورانی دیوی اُن سے اکثر اکیڈمی کی بابت پوچھا کرتی پریم چند نے جواب دیا

جس قسم کی انجمن ہم قائم کرنا چاہتے ہیں وہ تو نہیں ہوئی۔
شورانی۔ تب ان لوگوں نے یہ کیا کھولا ہے۔
پریم چند۔ کچھ نہ کچھ تو ضرور ہوگا۔

شورانی :- تو آپ لوگ مطمئن کیوں نہیں ؟
 پریم چند :- یہ کام کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے ۔ ہم تو جانتے تھے کہ منہدی
 کی ہرزبان کا ایک ایک لیکھک ہوا ۔ اس کمیٹی میں جس کسی موضوع
 پر کوئی کتاب نکلتی اسے پہلے لیکھکوں کی یہ کمیٹی دیکھ لیتی ، اس طرح
 کوئی بھڑی کتاب نہ نکل سکتی ۔ اس سے ان ادیبوں کے اوصاف کے
 ارتقار کو نقصان نہ پہنچتا ۔ اپنے یہاں ادب کی ترقی بھی ہوتی اور
 ساتھ ساتھ ان ادیبوں کا ارتقا بھی ہوتا ، جس چیز کی کمی ہوتی ،
 اس کا اضافہ کیا جاتا ۔ لیکھکوں کو ادھر ادھر بھٹکنے کی ضرورت
 ہوتی ۔ نئے لیکھکوں کے گن دوش کیسی بتانا نہیں ، بس نہیں ٹھیک
 ہے ؟ کہہ کر لوٹا دیا جاتا ہے ۔ یہ نیلے تھوڑی ہے نئے ادیبوں
 کے متعلق دانشوروں کا فرض یہ ہے کہ وہ ان کے گن دوش
 سمجھا دیں ۔ اس ڈھنگ سے اکیڈمی اپنا کام کرتی ۔ رہا معاوضہ
 کا سوال ۔ رائلٹی پر بھی لے سکتی تھی ، ایک مشت مے کر بھی لے
 سکتی تھی ۔

شورانی :- لیکھکوں کی چنائیں (تخلیقات) کہیں بڑی تھوڑی ہی رہتی
 ہیں ۔ ؟

پریم چند :- ایسے پبشرز کی ضرورت نہیں ہے جو اپنا ہی پیٹ
 بھریں ۔ ادیبوں کو بھی کچھ ملنا چاہئے ۔
 اکیڈمی اور ادیبوں کا تو کنبے کا سارشتہ

ہو جانا چاہئے۔ جب تک دونوں میں ایسا رشتہ نہیں ہو گا کچھ بھی نہیں ہونے کا۔ اس طرح جب لیکھک کو کچھ بھی فائدہ نہیں ہوتا تو وہ مایوس ہو کر بیٹھ جاتے ہیں، جس سے ادیبوں کا ارتقا نہیں ہوتا اور ادب کی ترقی رک جاتی ہے۔

شورانی :- ادب کی ترقی اور کیسے ہو ؟
پریم چند :- ابھی "ترقی" کا تو نام تک نہیں، بلکہ کہنا تو یہ چاہئے کہ کام سے زیادہ آپس میں "تو، تو، " میں میں " ہے۔ "تو تو" میں میں میں کہیں کام ہوتا ہے ؟

شورانی :- تب کام کیسے ہو گا ؟
پریم چند :- جب تک یہاں کا ادیب ترقی نہیں کرے گا۔ تب تک ادب، سماج اور سیاست سب کے سب جوں کے توں پڑے رہیں گے۔
شورانی :- تو کیا آپ ان تینوں کی ایک مالا سی پرونا چاہتے ہیں ؟
پریم چند :- اور کیا یہ چیزیں مالا جیسی ہی ہیں۔ جس زبان کا ادب اچھا ہو گا، اس کا سماج بھی اچھا ہو گا۔ سماج کے اچھا ہونے پر مجبوراً سیاست بھی اچھی ہو گی۔ یہ تینوں ساتھ ساتھ چلنے والی چیزیں ہیں۔

شورانی :- تو کیا ضروری ہے کہ تینوں کو ساتھ لے کر ہی چلا جائے۔
پریم چند :- ان تینوں کا مقصد ہی جب ایک ہے ادب اور سماج اور سیاست کا رشتہ بالکل الٹ ہے۔ سماج ادیبوں کے

گروہ ہی کو کہتے ہیں۔ سماج میں جو نفع نقصان اور سکھ دکھ ہوتا ہے وہ آدمی ہی پر ہوتا ہے نا۔ سیاست میں جو سکھ دکھ ہوتا ہے، وہ بھی آدمیوں پر پڑتا ہے۔ ادب لوگوں کا ارتقا ہوتا ہے اور آدمی کے خیالات اچھے یا بُرے بنتے ہیں۔ انہی خیالات کو لے کر آدمی جیتا ہے، اور ان سب تینوں چیزوں کی پیداوار کا باعث آدمی ہے۔

شورانی۔ آپ شاید جڑ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پریم چند، جڑ ہی کی حفاظت میں تو سب ممکن ہے بنا جڑ کے تحفظ کے کچھ نہیں ہوتا۔

شورانی :- ان لوگوں کے دماغ میں یہ باتیں کیوں نہیں آئیں۔ پریم چند :- بڑے آدمیوں کے دماغ میں کیوں آئیں؟ غریبوں کے مسائل کی طرف ان کا دھیان ہی کب جاتا ہے؟ جب تک ان پر نہیں بیتے گی، تب تک کیسے سمجھ سکیں گے، ان سبھوں کو سدھارنے کے لئے ادب ہی ایک ذریعہ ہے۔ جب تک کوئی اسے اپنے ہاتھ میں نہیں لے گا، تب تک نہیں سدھر سکتا۔

انھوں نے ہندی کے کچھ ادیبوں کو ساتھ ملا کر ایک "لیکچر سنگھ" بھی کھولا تھا، اور ہندی پریشد کو اس امید میں "ہنس" دے دیا تھا کہ وہ ادیبوں کی نثری اور ارتقار کے لئے سفید ثابت ہوگی لیکن اس پر تو خالصتاً سیٹھوں کا قبضہ تھا، اس لئے کیا ہوتا؟

پریم چند نے ہمیشہ سنہرے اور بلند خواب دیکھے تھے اور انہی خوابوں کو حقیقی شکل دینے کے لئے وہ جدوجہد کرتے رہے تھے۔ پہلے وہ اپنے ذات تک محدود تھے وہ اچھی تعلیم حاصل کر کے اچھا اور باعزت مقام حاصل کرنا چاہتے تھے، لیکن رفتہ رفتہ انھوں نے محسوس کیا کہ ایک آدمی کے ترقی کرنے سے کیا بنتا ہے۔ اگر سارا سماج سکھی ہو، سب کو سکھ کے ذرائع حاصل ہوں تبھی دراصل ایک آدمی بھی سکھی رہ سکتا ہے، ورنہ یہ سکھ بے کار ہے، یوں ان کی انفرادیت سارے سماج کی نائیڈ بن گئی۔ اور وہ بہتر سماج اور بہتر زندگی اور انسان کے بہتر مستقبل کے لیے دیکھنے لگے۔

جنگ جہاں تباہی اور بربادی لاتی ہے اور اس سے اقتصاد سنکٹ بڑھتا ہے، وہاں اس کا لازمی نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ طبقاتی کشمکش ابھر کر سامنے آ جاتی ہے۔ پرانے تصورات ٹوٹتے ہیں اور نئی شعور تیزی سے سوچنے لگتا ہے۔ اب چونکہ پریم چند کی انفرادیت سماج کی نائیڈگی کرتی تھی، اس لئے پہلی عالم گیر جنگ میں ہمارے سماج میں جو مسائل پیدا ہوئے اس میں جو ذہنی اور طبقاتی کشمکش بڑھی وہ ساری کشمکش ہمیں گوشہ عافیت میں نظر آتی ہے۔

شروع میں مھن پور مندرستان کے عام دیہاتوں کی طرح تباہ حال گاؤں ہے جسے غیر ملکی حکومت کے افسر اور پیادے زمیندار اور اس کے گمشدے اور ساہوکار سب مل کر ٹوٹتے ہیں لیکن ناول

کے آخر میں مایا شنکر اپنے زمینداری حقوق سے دست بردار ہو جاتا ہے اور زمینداری ختم ہوتے ہی مکھن پور کی کاپاپلٹ ہو جاتی ہے۔ سوٹ کھسوٹ سے نجات پا کر کسان کی دولت اس کی خوش حالی میں اضافہ کرتی ہے۔ خود پریم چند کے الفاظ میں مکھن پور کی تصویر ملاحظہ ہو:-

مایا شنکر اپنے دورے پر ہیں۔ اسی سلسلے میں مکھن پور بھی گئے ہیں، دیکھتے ہیں کہ وہی مکھن پور جو تباہی اور بربادی کا مسکن تھا اب بہار آفریں اور بہشت زار بن گیا ہے، وہاں خوب رونق اور صفائی ہے سبھی گھروں کے دروازوں پر سائبان لگے ہوئے ہیں۔ ان میں بڑے بڑے تخت کچے ہیں۔ اکثر گھروں میں سفیدی ہو گئی ہے۔ پھونس کے جھونپڑے مفقود ہیں۔ کبھی گھروں پر بھر پل ہیں۔ دروازوں پر بیلوں کے لئے پکی چرنیاں بنی ہوئی ہیں۔ ایک دو کے دروازے پر گھوڑے بندھے نظر آتے ہیں۔ پرانے چوپال میں اسکول ہے اور اس کے سامنے ایک کنواں ہے اور دھرم شالہ ہے.....“

اس کے علاوہ لوگوں کے پاس بیل گھوڑے ہیں۔ گھروں میں انج ہے۔ بلراج تو ڈسٹرکٹ بورڈ کا ممبر بن گیا ہے، جہاں پہلے کوئی اخبار کا نام بھی نہیں جانتا تھا وہاں اب اچھی خاصی لائبریری ہے، اور لوگوں کا اخلاق بھی سدھر گیا ہے۔“

ادیب ایک خوب صورت دنیا کا خیالی تصویر اس لئے پیش کرتا ہے کہ اگر لوگ دماغی طور پر حسین دنیا اور بہتر زندگی کے خواب دیکھنے

لگیں گے تو وہ اسے لانے کے لئے واقعی جدوجہد کریں گے۔ یعنی ادب خستہ حال زندگی سے بہتر زندگی کی طرف بڑھنے کے لئے راہ ہموار کرنا ہے۔

پریم چند نے ٹھیک ایسا ہی کیا تھا اور جب انھوں نے دیکھا کہ لوگ اسے لانے کے لئے واقعی جدوجہد کر رہے ہیں تو وہ بھی ملازمت سے مستعفی ہو کر اس جدوجہد میں شریک ہو گئے۔

گاندھی کی قیادت انھوں نے اس لئے قبول کی تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ اس سے غلامی کے بندھن ٹوٹیں گے۔ دینداری ختم ہوگی اور ملک میں خوش حالی آئے گی۔

وہ سمجھتے پرستی کو کبھی پسند نہیں کرتے تھے، اس لئے برل پارٹی کے ہمیشہ خلاف رہے اور گاندھی سے پہلے ملک کے مداح تھے۔ منشی دیانارائن نگم رقم طراز ہیں: ”پریم چند کا میلان طبع گرم دل کی طرف تھا۔ احمد آباد کانگریس دیکھنے ہم لوگ ساتھ ساتھ گئے اور ایک ہی جگہ ٹھہرے لیکن وہ مسٹر ملک کے طرفدار تھے اور میں مسٹر گوکھلے اور سر فیروز شاہ کا حامی تھا۔ ہر وقت بحث رہتی تھی۔ مگر دونوں اپنی جگہ قائم رہے۔“

جزوی اصلاحات کو وہ ناکافی سمجھتے تھے اور مارلی اور ناٹنگو جیمس فورڈ کی اسکیم سے مطمئن نہ تھے۔

آئینی اصلاحات کے متعلق ان کا نظریہ ۱۶ دسمبر ۱۹۱۹ء کے خط سے واضح ہو جاتا ہے لکھتے ہیں:-

”میں ریفارم اسکیم یا ایکٹ کے متعلق مسٹر جنٹلمن وغیرہم سے متفق نہیں ہوں۔ میرے خیال میں معتدل پارٹی اس وقت ضرورت سے زیادہ مغرور اور نازاں ہے۔ حالانکہ اصلاحوں میں اگر کوئی خوبی ہے تو صرف یہ کہ تعلیم یافتہ جماعت کو کچھ اسامیاں زیادہ مل جائیں گی اور جس طرح یہ جماعت وکیل بن کر رعایا کا خون پی رہی ہے اسی طرح انیڈ یہ حاکم بن کر رعایا کا گلا کاٹے گی۔ اس کے سوائے اور کوئی جدید اختیار نہیں دیا گیا ہے، جو اختیارات دئے گئے ہیں ان میں بھی اتنی نظر نہیں لگا دی ہیں کہ ان کا دینا نہ دینا برابر ہو گیا۔“

ننگم صاحب اُگے لکھتے ہیں ”پریم چند نابراہ کی لڑائی میں سمجھوتے کے خیال سے مشتبہ رہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کڑی جدوجہد کے بغیر کچھ حاصل نہ ہوگا اور وہ اس کے لئے عوام کو جلد سے جلد تیار کرنے کی طرف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ حکومت سے سخت شکریے بغیر کام نہ چلے گا۔ اور وہ اس کے لئے نقصانات برداشت کرنے کے لئے بھی تیار تھے۔ مگر یہ حکام سے انھیں عام طور سے بدظنی تھی اور بالآخر وہ سرکاری ملازمت ترک کر کے باضابطہ نان کوآپریشن ہو گئے۔ ایک خط کہ جس میں مہاتما جی کی تحریک نمک کو قبل از وقت کہا گیا تھا وہ نہایت گرم جوشی سے جواب دیتے ہیں:-

”جس طرح موت ہمیشہ قبل از وقت ہوتی ہے۔ ساہوکار کا تقاضا ہمیشہ قبل از وقت ہوتا ہے، اسی طرح ایسے سارے کام جن میں ہمیں

مالی یا وقتی نقصان کا اندیشہ ہر قبل از وقت معلوم ہوتے ہیں۔ اس تحریک کی قبولیت ہی بتا رہی ہے کہ وہ قبل از وقت نہیں ہے ؟ تحریک واقعی قبل از وقت نہیں تھی ۔ ملک واقعی لڑنے کے لئے تیار تھا ، لیکن جیسے ہی تحریک شہزوں سے نکل کر گاؤں میں پھیلنے لگی اور کسانوں نے لگان کی عدم ادائیگی کی مہم شروع کی ۔ گاندھی نے سوچ آف کر دیا ۔ گاندھی اردن پکیٹ ہوا ۔ آزادی تو کیا ملنی تھی گاندھی نے جن گیارہ نکات کا اعلان کر کے ڈانڈی مارچ شروع کیا تھا ، ان میں سے بھی ایک نہیں مانا گیا ۔

اس سمجھوتہ بازی سے پریم چند کو جو رنج پہنچا ۔ اسے انھوں نے ”گودان“ میں ایک فقرے میں بیان کر دیا ہے ۔ ”دل پر جتنا گہرا صدمہ ہوتا ہے وہ اپنے ردِ عمل میں اتنا ہی موثر ہوتا ہے “ پریم چند جس مکھن پور گاؤں کو جنت نظیر اور جس کسان کو خوش حال دیکھنا چاہتے تھے ۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ تباہ و برباد ہو گیا تھا ۔ ہوری کے گاؤں بیلاری کا نقشہ ملاحظہ ہو ۔

”گوبرنے گھر پہنچ کر اس کی حالت دیکھی تو ایسی مایوسی ہوئی کہ اسی وقت وہاں سے لوٹ جائے ۔ گھر کا ایک حصہ تو تھا ، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی گرا ، ابھی گرا ، دروازے پر ایک بیل بندھا ہوا تھا ، وہ بھی نیم جان “

اور یہ حالت صرف ہوری کی ہی نہ تھی ۔ سارے گاؤں پر یہی

مصیبت نازل تھی، ایسا ایک آدمی بھی نہ تھا جس کی رونی صورت نہ ہو،
گویا ان کی روح پر غم کا سکہ بیٹھا ہوا۔ انھیں کٹھ پتلیوں کی طرح پھار ہا
ہے۔ دروازے پر منوں کوڑا جمع ہے۔ بدبو اڑ رہی ہے، لیکن ان
کی ناک میں نہ سونگھنے کی حس باقی ہے، نہ آنکھوں میں دیکھنے کی طاقت
سیر شام ہی سے دروازوں پر گیدڑ رونے لگتے ہیں۔ لیکن انھیں کوئی
غم نہیں۔

ادھر ان کی یہ حالت ہے۔ ادھر انھیں لوٹنے والے سیلا رسی
کے دیس بھگت زمیندار کی ریاکاری ملاحظہ ہو :-

”بھئی ستیاگرہ کی لڑائی میں رائے صاحب نے بڑا نام کمایا تھا
کونسل کی ممبری چھوڑ کر جیل گئے تھے۔ جھبی سے ان کے علاقے کی
اسامیوں کو ان سے بڑی عقیدت ہو گئی تھی۔ یہ نہیں کہ ان کے علاقے
میں اسامیوں کے ساتھ کوئی خاص رعایت کی جاتی ہو یا تاوان بیگا
کی سختی کم ہو۔ مگر یہ ساری بدنامی تمھاروں کے سر تھی۔ رائے صاحب
کی نیک نامی میں کوئی بڑے نہ لگ سکتا تھا، وہ بے چارے بھی تو اس
ضابطہ کے غلام تھے“

اس سمجھوتہ بازی سے بہت سے لوگوں کا بھرم لڑتا تھا، خاص طور
پر ان نوجوانوں کا جو نہایت جوش اور خلوص کے ساتھ اس تحریک
میں شامل ہوئے تھے۔ گاندھی ازم اور امن سے ان کا اعتماد ٹوٹ
گیا۔ پریم چند اپنی ایک کہانی ”بھاڑے کے ٹٹو“ میں لکھتے ہیں :-

”ریش جیل سے نکل کر پکا انقلاب پسند بن گیا ہے۔ جیل کی تاریک کوٹھریوں میں تمام دن کی سخت محنت کے بعد وہ غریبوں کی فلاح اور اصلاح کے منصوبے باندھا کرتا تھا، سوچتا کہ انسان کیوں گناہ کرتا ہے، اس لئے ناکہ دنیا میں اس قدر افتراق ہے، کوئی تو عالی شان محلوں میں رہتا ہے اور کسی کو درخت کا سایہ بھی میسر نہیں، کوئی لاشیم و جواہرات سے منڈھا ہوا ہے کسی کو بھٹا کپڑا بھی نصیب نہیں ہے۔ ایسی بے انصافی دنیا میں اگر چوری، ہتیا اور ادھر م ہے تو یہ کس کا قصور ہے، وہ ایک ایسی الجھن قائم کرنے کے خواب دیکھتا تھا جیل کا کام دنیا سے اس افتراق کو ناپید کر دینا ہو۔ دنیا سب کے لئے ہے اور اس میں سب کو راحت و آرام سے بسر کرنے کا مساوی حق ہے۔ نہ ڈاکہ ڈالنا ہے، نہ چوری! چوری! دولت مند اگر اپنی دولت خوشی سے نہیں بانٹ دیتا تو اس کی مرضی کے خلاف تقسیم کر لینے میں کیا گناہ ہے؟ دولت مند سے گناہ کہتا ہے تو کہے، اس کا بنایا ہوا قانون اگر سزا دینا چاہتا ہے تو دے۔ ہماری عدالت بھی علیحدہ ہوگی۔ اس کے سامنے وہ کبھی ملزم ہوں گے۔ جن کے پاس ضرورت سے زیادہ دولت ہے..... جیل سے نکلنے ہی اس نے اس جماعتی انقلاب کا اعلان کر دیا۔ خفیہ الجھن قائم ہونے لگی، ہتھیار جمع کئے جانے لگے۔“

واقعی ملک میں طبقاتی جدوجہد تیز ہو گئی تھی۔ اشتراکی خیالات

کے نوجوانوں نے مزدوروں اور کسانوں کو منظم کرنا شروع کر دیا۔
 تھا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین انھنی نئے حالات سے پیدا ہوئی تھی۔
 اس کی داغ بیل ڈالنے والے وہ ترقی پسند اور انسان دوست
 ادیب تھے جو سیاست کی اس نئی ترقی پسند تحریک کے ہم نوا تھے
 جس کا مدعا دولت اور محنت کے اشتراک کو اور لوٹ کھسوٹ کو ختم
 کر کے مساوات کا نظام قائم کرنا تھا۔ انجمن کے اعلان نامہ میں کہا
 گیا تھا :-

”ہمارے ملک میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ پستی اور
 رجعت پسندی کو اگرچہ موت کا پروانہ مل چکا ہے لیکن وہ ابھی
 تک بے بس اور معزوم نہیں ہوئی۔ نئے نئے روپ بدل کر یہ ملک
 زہر ہمارے تمدن کے ہر شعبہ میں سرایت کرنا جا رہا ہے۔

اس لئے ہندوستانی مصنفوں کا فرض ہے کہ ملک میں جو نئے
 ترقی پذیر رجحانات ابھر رہے ہیں ان کی ترجمانی کریں اور ان کی
 نشوونما میں پورا حصہ لیں۔“

اس اعلان نامے کو مرتب کرنے میں پریم چند کا بڑا ہاتھ تھا
 اور انھوں نے اپنے خطبہ صدارت میں ”ادب کی غرض و غایت“
 بیان کرتے ہوئے کہا تھا :-

”ہماری کسوٹی پر وہ ادب پورا اترے گا جس میں تفکر ہو،
 آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی

حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت اور نہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے
 سلائے نہیں، کیونکہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی ۛ

یقیناً یہ الفاظ ایک فرد واحد نے نہیں سماج کے پورے شعور نے
 ادا کئے تھے، جس طرح اس تقریر سے پریم چند کے شعور کی بختگی اور سنجیدگی ظاہر
 ہے، اسی طرح وہ سنی صدر نہیں تھے، انھیں ان کا ارتقا ہی کرسی صدارت
 پر لایا تھا۔ ہم ایک ایسے شخص کو کرسی صدارت پر متمکن دیکھتے ہیں جس کی آنکھوں
 میں سنجیدہ اور آہنی عزم تھا جسے واقعی مظلوم انسانیت کی نمایندگی کا حق پہنچنا
 تھا۔

عمل

جیسے کا حاصل عمل کے سوا اور کیا

ہے - (پریم چند)

پریم چند نے اپنی بچوں کی رائے "رام چرچا" میں لکھا ہے کہ جب رام اور لکھمن راکششوں سے جنگ کرنے کے لئے دشو متر کے ساتھ پہلے راستہ میں دشو متر نے انھیں ایک ایسا منتر سکھایا جس کو پڑھنے سے تھکاوٹ بالکل نہیں آتی تھی۔

منتر یہ تھا کہ انھوں نے ظالم اور ظلم کے خلاف لڑنے کی ضرورت کو سمجھ لیا تھا اور وہ پورے شعور کے ساتھ جبر و تشدد کو ختم کرنے پر کمر بستہ ہو گئے تھے۔ جب آدمی ظلم کے خلاف با شعور جدوجہد کرتا ہے تو اسے کام

دیوتا دہ ہے جو نیائے کی حفاظت کرے اور اس کے لئے بران دیوے
 اگر وہ جان کر انجان بنتا ہے تو دھرم سے گرتا ہے۔ اگر اس کی آنکھوں
 میں یہ نظام کھٹکتا ہی نہیں تو وہ اندھا بھی ہے اور بے وقوف بھی
 — دیوتا کسی صورت نہیں۔

دندمن سے لڑنے کے لئے ان کے بیچ میں ہتھیار باندھنا پڑے
 گا۔ ان کے بچوں کا تشکار بننا دیوتا پن نہیں جان پڑتا ہے۔
 (سنس، اکتوبر ۱۹۴۵ء)

انجن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس نے ادب کے ذریعے
 کی ترقی پسند تحریک کو — آزادی کی جدوجہد کو آگے بڑھانے
 کا جو اعلان کیا تھا پریم چند اسے عملی صورت دے رہے تھے اور
 اسی مقصد کے لئے "منگل سوتر" لکھنا شروع کیا تھا، لیکن فیس
 کہ کانفرنس کے تھوڑا ہی عرصہ بعد وہ سخت بیمار پڑ گئے اور
 انھیں یہ ناول مکمل کرنے کی جہلت نہیں ملی۔

۲۵ جون کو رات کے ڈھائی بجے کے قریب یکایک ان کی
 طبیعت خراب ہو گئی۔ معدے کی بیماری انھیں مدت سے تھی اس
 کبھی افاقہ نہیں ہوا۔ ذرا سی بد پرہیزی کی اور بیمار پڑ گئے۔ لیکن
 اس مرتبہ انھیں خون کی قے آئی اور چہرہ زرد پڑ گیا۔ شورانی ان کی
 یہ حالت دیکھ کر گھبرا گئیں، لیکن ڈاکٹر نے تسلی دی کہ بلغم کی خرابی
 ہے، جلد آرام ہو جائے گا۔

لیکن یہ سب پیٹ کی خرابی تھی۔ اس دن چارپائی سے ایسا لگے کہ پھر چھوڑنے کی نوبت نہیں آئی۔ طبیعت بے چین رہتی تھی اور راتوں کو بند کم آتی تھی۔ لیکن وہ اس حالت میں بھی کام کئے جلتے تھے رات کو روشنی میں پڑھتے لکھتے تھے۔ اسی حالت میں ”منگل سوتر“ کے بیسیوں صفحات لکھ ڈالے۔ اب ان کی تخلیقات میں اپنی ذات اور درمیانہ طبقہ کم آتا تھا۔ اب انھوں نے اپنی انفرادیت کو اپنی ہستی کو وسیع انسانیت کے ساتھ ہم آہنگ کر دیا تھا۔ ان کے تصور میں وسعت تھی، اور انھیں نچلے طبقہ کی وکالت کرنا تھی۔ اس لئے گھیسو، مادھو، ہیری، دھنیا اور ٹلیسا ان کی کہانیوں کے اہم کردار تھے۔ ”کفن“ کہانی انھیں دنوں کی پیداوار ہے جس میں انھوں نے بتایا کہ لوٹ کھسوٹ کس طرح آدمی کی قوتِ کار کو سلب کرتی ہے شورانی انھیں اس بیماری کی حالت میں کام کرنے سے منع کرتی تھیں، لیکن پھر جلد ہی محسوس ہو گیا کہ ان کے نزدیک عمل ہی تو زندگی ہے۔ پھر منع کیا کرتیں!

جولائی میں وہ علاج کرانے لکھنؤ چلے گئے۔ وہاں کئی ڈاکٹر واقف تھے۔ انھوں نے بڑی ہمدردی سے معائنہ کیا اور مرض کی نوعیت اور اہمیت ذہن نشین کرائی۔ لیکن علاج سے فائدہ کچھ نہیں ہوا۔ اس لئے پھر بنارس لوٹ آئے۔ حالت پہلے سے بھی خراب ہو گئی تھی۔

اس حالت میں بھی لکھنا پڑھنا اور دوستوں سے خط و کتابت کرنا بدستور جاری رہا۔ بیماری بڑھ رہی تھی۔ موت قریب آ رہی تھی۔ لیکن نیکو نے ذہنی طور پر موت کو شکست دے رکھی تھی۔ معدہ کا مرض پرانا تھا بیس بائیس سال سے موت کے ساتھ کش مکش کرتے آئے تھے۔ جون ۱۹۱۵ء میں ایڈیٹر زمانہ کے نام ایک کارڈ میں لکھا تھا

”میرے لئے بڑھاپے کا ذکر فضول ہے، میں کسی بوڑھے سے کم ہوں۔“

اس کے بعد ۱۹۱۵ء میں گورکھ پور سے ایک خط میں لکھا تھا:-

”آپ کیا کہتے ہیں زندگی کی اُمید یہاں بھی کم ہے۔ مگر چاہتا ہوں کہ کیا تو ساتھ چلیں یا خفیف تقدیم و تاخیر ہو۔ میں آپ کا پیش رو بننا چاہتا ہوں۔ مگر موت کی فکر اسے ڈالتی ہے کتنا چاہتا ہوں، پرانا تا پر بھروسہ رکھوں، مگر دل موذی ہے سمجھتا نہیں۔ کسی مہاتما کی صحبت ملے تو شاید راستے پر آئے۔ یہی فکر ہے کہ آج مر جاؤں تو ان بچوں کا کون پرسانِ حال ہو گا۔ گھر میں کوئی ایسا نہیں ہے..... دوستوں میں اگر میں تو آپ اور اگر نہیں ہیں تو آپ اور نہ ہو گا تو میرے بعد سال در سال ان کی خبر تو لے سکتے ہیں۔“

اتنے عرصے سے وہ موت کو کامیابی کے ساتھ دھتہہ بتانے لگے تھے اب تو انھیں یہ اطمینان بھی ہو گیا تھا کہ موت ابھی جائے تو کیا فکر ہے۔ کچھ نہ کچھ کام تو کر لیا ہے۔ زندگی بے کار تو نہیں کھوئی

کام سے اُن کے دل میں جو یقین اور بھروسہ پیدا ہو گیا تھا اس کا اعلان مصلحتی نے "آرب کا فرض" افسانہ میں لکھ دیا ہے۔
 "ہمارا فرض ہے کام کرنا۔ ہم کام کرتے ہیں اگر اس پر بھی فائدہ کرنا پڑے تو میرا قصور نہیں۔ مرہی تو جاؤں گا۔ ہمارے جیسے لاکھوں آدمی ہر روز مرتے ہیں..... موت ڈرنے کی چیز نہیں، میں اس سے نہیں ڈرتا!"

اس ضمن میں اُن کا ایک خط قابل ذکر ہے، نیڈرٹ بنارس داس چترمدی نے ایک تہہ اُن کی خانہ نشینی کی شکایت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ انھیں جوانی اور زندہ دلی قائم رکھنے کے لئے سیر و سفر کرنا چاہئے پریم چند نے انھیں جواب دیا تھا :-

"نوجوانی اور زندہ دلی کا تعلق مزاج سے ہے۔ بہت سے نوجوان ہیں جو مزاج کے اعتبار سے مجھ سے بہت بوڑھے ہو گئے ہیں اور بہت سے مسن لوگ ہیں جو خیالات کے لحاظ سے مجھ سے بھی زیادہ نوجوان ہیں۔ لیکن ان کو یہی خیال ہے کہ اس اعتبار سے میری جوانی بہت ترقی کر رہی ہے۔ میں عقبی کا معتقد نہیں اس لئے آخرت کا خیال جو انسان کی نوجوانی کے لئے سب سے زیادہ مہلک ہے مجھے کبھی ستاتا ہی نہیں ہے۔ اہاں یہ ضرور ہے کہ جوانی بھی دو طرح کی ہوتی ہے، ایک صحت بخش اور دوسری جنوں انگیز۔ صحت بخش جوانی کا خاصہ یہ ہے کہ انسان فطرتاً خادوں سے بچتا ہوا ایک ترقی پذیر اور پر امید

راستہ اختیار کرے۔ جنوں امگیر شیا ب میں آدمی اندھا رہتا ہے اپنی قابلیت کے متعلق مبالغہ آمیز خیال رکھتا ہے۔ اور اپنے ارمانوں کی تکمیل کے شاندار خواب دیکھا کرتا ہے۔ میں بھی کبھی کبھی خواب دیکھتا ہوں اور بعض اوقات نا عاقبت اندیشی بھی کر بیٹھتا ہوں، مگر افراط و تفریط سے بچا رہتا ہوں، اس لئے جنوں کے بہتر ہی سے حظ اٹھاتا ہوں اور اب یہ محسوس کرنے لگا ہوں کہ قناعت کی گھریلو زندگی دنیا کی بہترین نعمت ہے۔“

جس آدمی کے عمل کی یہ نوعیت ہو کہ اس نے سمجھ سوچ کر ترقی پذیر اور پر امید راستہ اپنا لیا ہو جو جنوں کو رہنما بنانے کی بجائے خود جنوں کی رہنمائی کر رہا ہو، اُسے موت کہاں سنا سکتی ہے؟

اگست کا مہینہ تھا۔ اس بیماری کی حالت میں ایک دن رات کو دو بجے اٹھ کر فرش پر بیٹھ گئے، لکھنے لگے۔ دو روز بعد آج کے آفس میں گورگی کی موت پر بینک ہونے والی تھی، اس کے لئے تقریر لکھ رہے تھے۔ شورانی کو بھی ان دنوں نیند نہیں آتی تھی، بیمار داری میں لگی رہتی تھیں۔ انھوں نے کہا ”جب طبیعت ٹھیک نہیں تو بھاشن کیسے لکھا جائے گا؟ اور پھر لکھنا کیا ضروری ہے۔“

آپ بولے۔ ضروری تو نہیں ہے۔ بنا لکھے کام نہیں چلے گا۔ اپنی خوشی سے کام کرنے میں آرام یا تکلیف کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ کو آدمی فرض سمجھ لیتا ہے، اس کو کرنے میں تکلیف نہیں ہوتی۔

ان کاموں کو آدمی سب سے زیادہ ضروری سمجھتا ہے۔

شورانی :- یہ میسنگ ہے کیسی ؟

پریم چند :- افسوس کرنا ہے ۔

شورانی :- وہ کون ہندوستانی تھے ؟

پریم چند :- یہی تو ہم لوگوں کی تنگ دلی ہے ۔ گور کی اتنا بڑا لیکھ تھا

کہ اس کے متعلق قومیت یا وطنیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔

لیکھک ہندوستانی یا یورپین نہیں دیکھا جاتا ۔ وہ جو کچھ لکھے

گا اس سے سبھی کو نادمہ ہوتا ہے ۔

شورانی :- ٹھیک ۔ اس نے ہندوستان کے لئے بھی کچھ لکھا ؟

پریم چند :- تم غلطی کرتی ہو رانی ! لیکھک کے پاس ہوتا ہی کیا ہے ،

جسے وہ الگ بانٹ دے ۔ لیکھک کے پاس تو اس کی تپسیا

ہی ہوتی ہے ۔ وہی سب کو وہ دے سکتا ہے ۔ اس سے

سب لیگ مستفید بھی ہوتے ہیں ۔ لیکھک جو تپسیا کرتا ہے اس

سے جتنا کا بھلا ہوتا ہے ۔ وہ اپنے لئے تو کچھ بھی نہیں کرتا ۔

شورانی :- گاؤں والوں میں تو شاید ہی کوئی گورنگی کا نام جانتا ہو ؟

پریم چند :- یہاں کے گاؤں کی بات چھوڑو ؟ یہاں کے لوگ تو انہوں

کو نہیں جانتے ۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ یہاں کے لوگوں کے لئے

کچھ کام ہی نہ کیا جائے ۔

شورانی :- جانتے کیوں نہیں ؟ تلسی ، سور ، کبیر وہ کس کو نہیں

جانتے ؟

پریم چند۔ ان کو بھی جاننے والے جگاول میں تھوڑے ہیں۔ اس کا سبب ہے تعلیم کی کمی۔ ابھی یہاں تعلیم بہت تھوڑی ہے، اس وجہ سے یہاں جو کچھ ہوتا ہے وہ بہت تھوڑے لوگوں کے لئے ہو کر رہ جاتا ہے۔ جب گھر گھر تعلیم کا پرچار ہو جائے گا تو کیا گور کی کا اثر بھی گھر گھر نہیں ہو جائے گا ؟ وہ بھی تلسی سیر کی طرح چاروں طرف پورے جائیں گے۔

کمزوری اور نقاہت کے باوجود ٹینک میں گئے، زینہ چڑھتے چڑھتے دم اٹھ گیا۔ ٹینک میں کھڑے نہیں ہو سکے۔ کسی اور صاحب نے ان کی تقریر پڑھ کر سنائی۔ لوٹ کر آئے تو پاؤں لڑکھڑا رہے تھے چلنا مشکل تھا۔ شورانی نے شکایت کی۔ ناحق پریشانی اٹھائی۔ نہ گئے ہوتے۔ آپ نے جواب دیا "کم زوری آئے یا چاہے جو کچھ کہیں اس طرح بیٹھا جاتا ہے۔"

ستمبر کے آخر میں ان کی حالت بہت خراب ہو گئی، معدہ میں گیسٹرک السر کی شکایت تھی کھانا ہضم نہیں ہوتا تھا، جس کے مارے قے یا دست ہو جاتے تھے، ورنہ پیٹ پھولا رہتا تھا جیسے پانی بھر گیا ہو، وہ اکثر بے ہوش بھی رہنے لگے۔

موت سامنے تھی مگر انھیں موت کا ڈر نہیں تھا، آخرت کی فکر نہیں تھی۔ انھیں فکر تھی تو بس اس دنیا کی جس کو وہ سنوارنا اور حسین

بنانا چاہتے تھے، اور اس دنیا کو کیسے سنوارا جاسکتا ہے۔ اس کا اصل گیان انھیں حال ہی میں — نہک ستیاگرہ کی سمجھوتہ بازی کے بعد ہوا تھا۔ دشمن صاف روپ میں سامنے تھا، اور اس پر وہ بھرپور وار کر رہے تھے۔ اُن کی آخری کہانی ”دو بہنیں“ ہیں جو اکتوبر ۱۹۳۷ء میں ”عصمت“ دہلی میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں اُن کا ایک کردار کہتا ہے۔

”جتنے دولت مند ہیں، لٹیڑے ہیں۔ میں بھی انھی میں ایک ہوں کل میرے پاس روپے پوچھائیں اور میں ایک دھرم شالہ بنادوں۔ پھر دیکھئے میری کتنی واہ وا ہوتی ہے۔ کین پوچھتا ہے۔ مجھے یہ دولت کہاں سے ملی ہے۔“

وہ اس نظام کو جس میں دھوکے دھڑی اور فریب سے دولت کمانا جائز ہے، جس میں بلیک مارکیٹ اور لوٹ کھسوٹ کے ذریعے محنت کش طبقے کا گزشتہ نوچنے والا گدھ اور لٹیڑا ایک دھرم شالہ بنا کر ”دان دیر“ اور ”دھرماتا“ کہلاتا ہے، اسے وہ ختم ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ ”منگل سوتر“ میں انھوں نے جو کہانی شروع کی تھی یہی اس کا انجام تھا۔ اگر وہ خود اسے ”نکتہ“ عروج تک نہیں پہنچا سکے تو کم از کم ایسی جزئیات فراہم کر دینا چاہتے تھے کہ ان کے بعد آنے والے دوسرے ادیب اس کا انجام لکھ سکیں۔

اپنا یہ پیغام وصیت کرنے کے لئے انھوں نے آخری وقت میں اپنے تمام دوستوں اور رشتہ داروں کو جمع کر لیا تھا، لڑکے، لڑکی

بھائی اور سارے کے علاوہ ان کے عزیز دوست منشی دیانا نارائن نغم ،
 چندر کمار جین وغیرہ بنارس پہنچ گئے۔
 منشی دیانا نارائن نغم لکھتے ہیں:-

”موت سے چندرہ دن پہلے تار دے کر مجھے بنارس بلایا۔ تمام
 راستہ عجیب اُمید و بیم کی حالت میں گُٹا۔ صبح کو آخری ملاقات کا سماں
 عمر بھر نہ بھولے گا، دلہی پریم چند جو اپنی سُرخ و سپید صورت کے لحاظ
 سے ہزاروں میں ایک تھے، ایسے زار و نزار ہو گئے تھے کہ مشکل سے
 پہچان پڑتے تھے۔ دھنسی ہوئی آنکھیں، بیٹھے ہوئے گال۔ کانٹے کی
 طرح سر لکھے ہوئے ہاتھ بائیں دیکھ کر آنکھوں کے سامنے اندھیرا
 چھا گیا۔ ان کے مسلسل فتنے بات کرنے کی بھی مہلت نہ دیتے تھے، مگر
 اب آنسوؤں کا تار بندھا ہوا تھا۔ نہ اُٹھنے کی طاقت تھی، نہ بیٹھنے
 کی سکت۔ لیٹے ہی لیٹے ہاتھ پکڑ لیا اور گلے سے چٹایا، جیسے کوئی
 ڈرا ہوا بچہ بلک بلک کر سینے سے چپنے کی کوشش کرے، اتنے کمزور
 ہو گئے تھے کہ بات کرتے بھی ٹھکن ہوتی تھی تاہم دم لے کر آہستہ
 آہستہ باتیں کرتے ہی رہے۔ میں نے منع کرنا چاہا تو کہنے لگے کہ دو یا
 ملاقات کی اُمید نہیں۔ ورنہ تمہارا کہنا نہ ٹالنا، یہاں اور جو کوئی آتا ہو
 یا اس انگیز باتیں کر کے پریشان کر جاتا ہے۔ بیوی کی طرف اشارہ
 کرتے کہا کہ اگر یہ دھارس نہ بندھائے رہیں تو کب کا مر چکا ہوتا۔ واقعی
 منتر پریم چند نے ان دنوں بڑی ہمت سے کام لیا اور دل شکن حالات

ایشور کی عبادت میں نہیں کرنا چاہتا۔ جو لوگ موٹے ہیں ان کے لئے ایشور ہوگا، کیونکہ وہ دنیا کو اس کی رحیمی کی بدولت لیٹے ہیں۔ ہم جیسوں کو تو ایشور کی دیا کہیں نظر نہیں آتی۔ ہاں اس کی سزا کا خوف قدم قدم پر کھڑا گھور رہا ہے.....“

لیکن جنڈر نے بحث جاری رکھی اور ایشور اور ستیہ دھپائی میں تعلق جوڑنے کی کوشش کی تو پریم چند اور واضح ہو گئے۔
جب تک دنیا کا یہ نظام قائم ہے مجھے ایشور پر دشمنانہ نہیں آنے کا۔ اگر میرے جھوٹ بولنے سے کسی کی جان بچتی ہے تو مجھے مطلق تامل نہ ہوگا۔ میں ہر ایک فعل کو اس کے اسباب تحریک کے اعتبار سے دیکھتا ہوں، جس سے دوسروں کا بھلا ہو وہی سچ ہے۔ جس سے دوسروں کو نقصان ہو وہی جھوٹ ہے۔“

جنڈر کو اُمید تھی کہ وہ مرنے سے پہلے ایشور کو یاد کریں گے، اور ہر ایک آس تک اسی خام خیالی میں مبتلا رہتا ہے جنڈر کی یہ اُمید پوری نہیں ہوئی۔ وہ پریم چند کے قریب بیٹھے تھے انہوں نے اپنا داستان سوجایا تھا بڑھا کر جنڈر سے کہا ”دادا“ پریم چند آدھی رات تک باتیں کرتے رہے۔ وہ باتیں ”منہس“ سے متعلق تھیں۔ ادب اور اس کے مستقبل سے متعلق تھیں۔ ان کی آرزوئیں اور تمنائیں الفاظ سے کہیں زیادہ آنکھوں سے نمایاں

تھیں۔

آخر صبح - ۸ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو عمل کی قوت ختم ہو گئی۔ دنیا کا
 روپ نکھارنے والا قلم رُک گیا۔ زندگی کو اجالنے والا چراغ مغل
 ہو گیا۔ اور یوں اُنھوں نے اپنی زندگی کی کہانی کو نکتہ عروج
 پر پہنچا کر ختم کر دیا۔

آرٹ

ادب اپنے زمانے کا عکس ہوتا
ہے جو جذبات اور خیالات لوگوں
کے دلوں میں ہل چل پیدا کرتے ہیں

وہی ادب میں اپنا سایہ ڈالتے ہیں (پریم چند)
پریم چند کی زندگی کے مطالعہ کے بعد اُن کے ادب پر بحث کی زیادہ
گنجائش نہیں رہتی۔ ہر ایک ادیب کا آرٹ اس کی شخصیت کا حصہ
ہوتا ہے۔ کوئی ادیب جتنا ہی اپنے وقت کی روح کو پہچان لیتا ہو
اور تاریخ کی ارتقار پذیر حقیقتوں کو سمجھ کر اُن کا ساتھ دیتا ہے اتنا
ہی اس کا ادب بلند، موثر اور ہمہ گیر ہوتا ہے اور اتنا ہی وہ مستقل اور

قائمی قدروں کا حامل ہوتا ہے [پریم چند نے قریب قریب تین سو افسانے اور لگ بھگ ایک درجن ناول لکھے، انھیں سلسلے وار پڑھنے سے ہمارے ملک کی بیسویں صدی کے شروع پینتیس پچیس سال کی تاریخ مرتب ہو جاتی ہے۔ گو پالا پریم چند کے ادب کی تاریخ ہمارے ملک کی سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کی تاریخ ہے]

(لیکن ان کا ادب صرف اپنے زمانے کا عکس ہی پیش نہیں کرتا بلکہ انھوں نے زندگی کے جو گہرے اور ان مٹ نقوش تیار کئے ہیں ان سے ہمیں یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ یہ نقوش اگے کس سمت میں بڑھ رہے ہیں اور واقعات کے تاریخی دھارے کا آئینہ رخ کیا ہے۔ یعنی ادیب کا کام صرف زندگی کو پیش کرنا ہی نہیں بلکہ جہاں زندگی کی کمی ہو وہاں اسے تخلیق کرنا بھی ہے، اور پریم چند نے یہ فریضہ بھی اچھی طرح سر انجام دیا ہے۔ اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے کر وہ بڑے طبعان سے کہتے ہیں "یہ سب ہوتے ہوئے بھی ہمارا مستقبل بہت روشن ہے مجھے اس میں مطلق شبہ نہیں، ہندوستان کی روح ابھی زندہ ہے"

"میدانِ عمل"

تبدیلیاں ہمیشہ شخصیتوں اور واقعات میں رونما ہوتی ہیں لیکن ان تبدیلیوں کا سبب سامنے آنے والی شخصیتوں اور واقعات ہی میں نہیں بلکہ سماج میں جو ہوتا ہو۔ ادیب کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ ان شخصیتوں اور واقعات کا تجزیہ کر کے ان اسباب کی جڑیں سماج میں تلاش کرے جتنا وہ اس مقصد میں کامیاب ہوتا ہے اتنا ہی اچھا

ادب موثر اور مفید ہوتا ہے اور جہاں وہ تجزیہ کرنے میں ناکام رہتا ہے وہیں اس کا ادب غیر موثر اور کمزور ہو جاتا ہے۔

اسی بات کو دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ادب سماج میں سچے جذبہ شخصیتوں اور واقعات کو مثال کے طور پر چن لیتا ہے اور ان کی نشانی میں وہ مجموعی زندگی کا تجزیہ کرتا ہے۔ خدیو پریم چند نے اس بات کو یوں پیش کیا ہے :-
 ”ادب کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں۔ لیکن میرے خیال میں اس کی بہترین تعریف تنقید حیات ہے۔ چاہے وہ مثالوں کی شکل میں ہو، یا انسانوں کی یا شعر کی۔ اسے ہماری حیات کا تبصرہ کرنا چاہیے۔“

لیکن تنقید حیات ادب کی پہلی منزل ہے۔ ادیب کا کام اس منزل پر تک جانا نہیں۔ بلکہ آگے بڑھنا ہے۔ بالزک اور چارلس ڈکنز وغیرہ ادیبوں نے بھی اپنے سماج کی بڑی بے باکی سے تنقید کی ہے۔ کیونکہ انھیں یہ خطرہ نہیں تھا کہ ایسا کرنے سے وہ سماج کی جڑیں ہلا دیں گے اور نہ ہی انھیں اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی تھی، کیونکہ سرمایہ داری اپنے عروج پر تھی اور اس کی مدد مقابل کو کی ایسی تحریک نہیں تھی جس کا مقصد اس سے بہتر سماج قائم کرنا ہو۔ اس وقت تنقید حیات ہی ادب کی بہترین تعریف تھی۔

لیکن جب سماج انقلابی دور میں سے گزر رہا ہو، جب پرانے اور بوسیدہ سماج کی جگہ نئے اور بہتر سماج کی تعمیر کے لئے جدوجہد جاری ہو تو ادیب کا کام جانب داری کے ساتھ لوگوں کو اس تحریک کے لئے

تیار کرنا ہوتا ہے۔ اگر اس وقت تنقید کو ترغیبِ عمل سے الگ رکھا جائے تو ادب ادب نہیں رہتا یا کم از کم ادیب اپنا پورا فرض سرانجام نہیں دیتا ایسے دور میں بہتر اور صحیح ادب وہی ہوتا ہے جس میں تنقیدِ حیات کے ساتھ ترغیبِ عمل بھی گتھی رہتی ہے۔ پریم چند گو تنقیدِ حیات کو ادب کی بہترین تعریف کہتے ہیں لیکن وہ خود ترغیبِ عمل بھی دیتے ہیں:-

”جس قوم کی بنیاد وہی بے انصافی پر ہو، اس کی سرکار کے پاس سختی کے سوا اور کیا دوا ہو سکتی ہے۔ ایک دن اُسے گاجب آج کے دیو کا نکر بچھر کی طرح اٹھا اٹھا کر گلیوں میں پھینک دئے جائیں گے۔“

”میدانِ عمل“

لیکن یہ منزل بھی دوسری منزل ہے: آخری اور تیسری منزل اس سے آگے ہے جو کافی کٹھن ہے اور دشوار گزار ہے۔ ادیب کا اصل امتحان اس منزل پر پہنچ کر ہوتا ہے۔ یہیں کھرا اور کھڑا پرکھا جاتا ہے۔ یہ منزل ہے عمل کو کامیابی کے ساتھ اپنے فطری نتیجے تک لے جانا۔ سماج کی نئی طاقتوں کو پرانی اور بے سیدہ طاقتوں سے ٹکرا دینا۔ یہ کام سہل نہیں بہت کٹھن ہے۔ ادیب اپنے طبقے کے اعتبار سے پرانے سماج کے ساتھ ہزار رشتوں سے بندھا ہوا ہوتا ہے۔ جب تک وہ ایک رشتہ توڑ کر اپنے آپ کو پرانے سماج سے الگ نہ کرے۔ جب تک کہ وہ شعوری طور پر اپنے آپ کو نئے سماج سے پوری طرح وابستہ نہ کرے جب تک کہ وہ اپنے آپ کو نئے سماج کی نئی قوتوں کا ہی ایک جز نہ بنائے تو نکر

پتھر کے دیوتاؤں کو اٹھا کر پھینکتے وقت اس کا ہاتھ کانپ جلے گا اپنے
عمل کو ادھورا چھوڑ دے گا، اور کمزوری اور پستی کو چھپانے کے لئے
جیل فلسفے کی آڑ لے گا۔

جب ہم اس منزل پر پہنچتے ہیں تو پریم چند کا تضاد ابھرتا ہے۔
ہمیں اُن کی ذہنی حدود کا پتہ چل جاتا ہے۔ تب ہمیں معلوم ہو جاتا ہے
کہ انھوں نے ادب اپنے زمانے کا عکس ہوتا ہے کیوں کہا ہے اور انھوں
نے صرف تنقیدِ حیات ہی کو ادب کی بہترین تعریف کیوں بتایا ہے
جب کہ وہ خود اس سے بہت آگے جلتے ہیں؛

پریم چند نے چونکہ تحریکِ آزادی کو بڑھانے کے لئے ادب کی تخلیق
کی تھی۔ اور خود بھی ملازمت سے مستعفی ہو کر اس تحریک میں شامل
ہو گئے تھے۔ اس لئے انھوں نے جیتے جاگتے باعمل کردار پیش کئے ہیں
جو صرف تحریکِ آزادی کی بابت سوچتے ہی نہیں بلکہ تحریک میں شامل ہو
ہیں، اور اس میں عملی حصہ لیتے ہیں۔ لیکن ان کے عمل کی ایک حد قائم
ہے۔ جب عمل اس سے آگے بڑھنے لگتا ہے تو وہ اسے جھٹ روک
دیتے ہیں، اور جھڑپے فلسفے کی آڑ لے کر اپنے سن کو تسکین دیتے ہیں
اور بعض مرتبہ تو تسکین بھی حاصل نہیں ہوتی، دل میں کرید لگی رہتی

ہے۔
۱ مثلاً ان کا ناول ”پردہ مجاز“ یعنی ”کایا کلپ“ کو لیجئے۔ اس کا ہیرو
چکر دھر پر جوش اور پر خلوص نوجوان کی شکل میں ہمارے سامنے آتا

ہے۔ اسے سماج کی فرسودہ روایات، غلامی اور سفلہ پن سے نفرت ہے، وہ آزاد، حسین اور بہتر دنیا کا مستحق ہے۔ اس لئے وہ معقول باتیں کرتا ہے۔ ہم اسے نہایت بے باکی کے ساتھ کہتے ہوئے سنتے ہیں۔ میں بدنامی کے خوف سے بے انصافی کرنا تو انہیں سمجھتا " احد انصاف اور بے انصافی کی جڑیں مادی حالات میں ہوتی ہیں اس لئے چکر دھر کہتا ہے :-

"یہ مادیت ہمیں روحانیت کی طرف بے جا لے گی۔ مہنتی کے وہ اہل جن پر اب تک پردہ پڑا ہوا ہے کھل جائیں گے "

(پردہ جانا)

وہ باہل نیوجوان ہے، خاندانی رسم و رواج سے بغاوت کرتا ہے، ہندو مسلم فساد روکنے کے لئے اپنی جان خطرے میں ڈال دیتا ہے، لوٹ کھسوٹ، ظلم، بے انصافی کے خلاف سٹیگرہ کرتا ہے، مظلوم طبقے کا ساتھ دیتا ہے۔ لیکن جب کھیت مزدور لوٹ کھسوٹ سے تنگ آ کر ظلم کو میٹلنے پر کمر بستہ ہو جاتے ہیں۔ راجہ کے کارندوں، افسروں اور سپاہیوں پر حملہ کرتے ہیں، چکر دھر کا دل کانپ جاتا ہے۔ وہ آگے بڑھ کر اور خود زخمی ہو کر ان کے اس فطری عمل کو روک دیتا ہے اور دل کو سمجھانے کے لئے باطل فلسفے کی کڑ لیتا ہے :-

"وہ سوچ رہا ہے، یہ خوں ریز ہنگامہ کیوں ہوا۔ میں نے تو بھول کر بھی کسی سے یہ قریک نہیں کی..... یہ ہماری نیت کا نتیجہ ہے ہمارے

پیغام صلح کی تہ میں نفس پروری چھپی ہوئی ہے۔ اگر سہاری نیت صاف ہوئی تو مخلوق کے دلوں میں راجائیں پر چڑھ دوڑنے کا جوش ہی پیدا نہ ہوتا۔

ظاہر ہے کہ یہاں چکر دھرنے، اَدیت کے فلسفہ کو الگ پھینک کر روحانیت کا غل اور ٹھلایا ہے اور وہ کھیت مزدوروں کے فطری غصے کے مادی اسباب نظر انداز کر کے اسے ”نیت“ ”دلوں“ اور ”افراد“ سے وابستہ کر رہا ہے۔ جو خالصاً رجعت پسندی کا خاصہ ہے۔ لیکن چونکہ وہ شعوری طور پر رجعت پسند نہیں بلکہ ایمان دار ہے۔ اس لئے اس سے اس باطل فلسفہ سے تسکین نہیں ملتی۔ دل میں کریڈ لگی رہتی ہے۔ سوچتا ہے :-

”پھر اگر ظلم کی مخالفت نہ کی جائے تو تنظیم سے فائدہ ہی کیا؟“
اب ہوتا یہ ہے کہ چونکہ تنظیم سے کوئی فائدہ نہیں آتا اس لئے چکر دھرنے کا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر سیاسی دھارن کر لیتا ہے۔ گمنامی اور بے عملی کی زندگی بسر کرتا ہے۔ چونکہ مادیت کا راستہ چھوڑ دیا اس لئے ہستی کے اسرار پر پردہ ہی پڑا رہتا ہے۔ اور پریم چند کے آرٹ نے آواگون کے گورکھ دھندا میں الجھ کر اپنا جہر کھو دیا ہے ایک غیر مارکسی ادیب نے اس ناول پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے ”ربط اور روانی پہلے حصہ میں کچھ زیادہ ہے مگر رفتہ رفتہ کم ہوتے ہوئے قائب ہو گئی۔“ وجہ معلوم !

اسی طرح ”ڈائل کا قیدی“ کہانی اس وقت تک دلچسپی کا باعث بنی رہتی ہے جب تک پریم چند مل کے مالک سیٹھ کی زر پرستی منانے خوری اور ریا کا رہی کی قلعی کھولنے ہیں اور مزدوروں کے غل کو ابھارتے ہیں۔ لیکن جب گوبی ناتھ مزدوروں کے عمل کی رہنمائی کرنے کے بجائے ان کے غصہ اور سیٹھ کے درمیان آکر ہڑتال توڑنے کا کام کرتا ہے، اور گھائل ہو کر مرتا ہے تو پھر ذہنی آداگون کا غیر فطری عمل شروع ہوتا ہے۔ اور کہانی بے اثر اور غیر دلچسپ ہو کر رہ جاتی ہے۔

اس ان کے ایک دوسرے ناول ”میدان عمل“ کو لیجئے۔ اس ناول کا ہیرو۔ امرکانت، چکر دھر سے بہتر شعور کا مالک ہے۔ اس کے کردار میں زیادہ سلجھاؤ اور احکام ہے جو تجربے اور عمل سے پیدا ہوا ہے اور ہم اپنی آنکھوں سے اس کا ارتقا ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ وہ چکر دھر سے بہت آگے کی بات سوچتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ مسئلہ ملک کی تحریک میں مسئلہ عمر کی خلافت کا مذہبی رنگ شامل نہیں تھا۔ اب تحریک آزادی مذہبی جذبہ نہ رہ کر ٹھوس اقتصادی تصویر بن گیا تھا اور اس میں نوجوانوں کا انقلابی جذبہ شامل تھا، چنانچہ پریم چند کا یہ ہیرو بھی اپنے ماحول کے مطابق اسی انداز سے سوچتا ہے۔

”امرا انقلاب ہی میں ملک کی نجات سمجھتا تھا۔ ایسے انقلاب میں جو عالم گیر ہے جو زندگی کے غلط اصولوں کا، ملک رسوم کا اور مہلک بندشوں کا خاتمہ کر دے جو ایک نئے دور کا حامل ہو۔ ایک نئی دنیا

آباد کرے۔ جو مٹی کے ان گنت دیوتاؤں کو تڑپھڑپڑ کر زمین دوز کر دے
جو انسان کی ثروت اور مذہب کی بنیادوں پر ٹکھنے والے نظام حکومت
سے آزاد کر دے۔“

چنانچہ وہ اپنے اس خیال کو عملی شکل دینے کے لئے سود خور اور چوری
کا مال ہڑپ کرنے والے باپ سے بغاوت کرتا ہے۔ اس کا گھر اور دولت
تباہ کر گاؤں میں جا کر کسانوں اور کھیت مزدوروں میں رہنے لگتا ہے
لیکن جب یہی کسان مزدور اس کے خراب کو عملی شکل دینے کے لئے تیار
ہو جاتے ہیں۔ ثروت اور مذہب کی بنیادوں پر ٹکھنے والے نظام حکومت
سے آزاد ہونے کے لئے حملہ شروع کرتے ہیں تو اپنے ہی مذہب اور
”تعلیم یافتہ طبقے کو ان گنواروں کی چوٹ کی زد میں آتے دیکھ کر امر کا
دل لرز جاتا ہے۔ اور وہ غصہ درہجوم کے سامنے لیٹ کر اپنے لنگوٹے
ساتھی سلیم کو صاف بچا لیتا ہے۔

اب چونکہ امر ستیا گرہ کر کے جیل خانے ہی کو عمل کی آخری متسز
سمجھ لیتا ہے۔ اس لئے اس کے دل میں کرید بھی پیدا نہیں ہوتی جو چکر چھڑ
کے دل میں پیدا ہوئی تھی۔ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ اس کا سود خور باپ
بھی تہر دیہ پر یورتن کے چورن سے شدھ ہو کر جیل میں آ جاتا ہے،
اور وہاں سے رہا ہو کر بیٹا باپ کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اس گھر
کو واپس لوٹ جاتا ہے جہاں سے بغاوت کر کے وہ عالم گیر انقلاب
کرنے نکلتا ہے۔

یہ ستیاگرہی کی جیت ہو سکتی ہے۔ لیکن انقلابی کی شکست میں کلام نہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پریم چند کا ہیروز یا آرٹ شکست کیوں قبول کرتا ہے؟ اس کی وجہ کیا ہے؟
پریم چند کو اصلاح پسند بنانے والے ادیب اور تنقید نگار کہتے ہیں کہ یہ گاندھی ازم ہے۔

ان کی یہ بات مننے سے کسی کو بھی تامل نہیں ہو سکتا۔ بے شک گاندھی ازم ہے۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ اب ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ گاندھی ازم کی سماجی بنیاد کیا ہے؟
جس طرح سماج میں پیدا ہونے والی تبدیلیاں شخصیتوں اور واقعات میں رونما ہوتی ہیں، اسی طرح سماج سے پیدا ہونے والا ہر فلسفہ بھی شخصیتوں اور واقعات میں رونما ہوتا ہے۔ کسی فلسفہ کو ایک شخص کی ذات سے منسوب کیا جا سکتا ہے، لیکن وہ اس پر وحی یا نازل نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ اس شخص کی ذات کے ساتھ پیدا ہوتا اور مرتب ہوتا ہے۔ یہی اصول گاندھی ازم پر صادق آتا ہے جو گاندھی کی ذات سے منسوب ضرور ہے لیکن ہمیں اس کی جڑیں اپنے طبقہ واری سماج میں طبقوں میں ڈھونڈنے سے ملیں گی۔

پریم چند ۱۸۹۷ء میں مہدی ساہتیہ پریشد کی ٹیٹل کے سلسلے میں دروہل گئے اور یہاں ان کی گاندھی سے پہلی اور آخری ملاقات ہوئی، تو کرائے تو اس ملاقات کا ذکر شورانی سے کیا۔ وہ گاندھی کی شخصیت سے

بہت متاثر تھے۔ شورانی بولیں۔ اس کا مطلب ہے آپ بھی مہاتما گاندھی کے چیلے ہو گئے۔

پریم چند :- چلیا بننے کا مطلب کسی کی پوجا کرنا نہیں۔ اس کے گنوں کو اپنانا ہوتا ہے۔ میں نے انھیں اپنا کر ہی تو "پریم اشرم" (گوشہ عافیت) لکھا جو ۱۹۳۷ء میں چھپا ہے۔

شورانی :- وہ تو پہلے ہی سے لکھا جا رہا تھا۔ اس میں مہاتما گاندھی کی کون خاص بات ہوگی۔

پریم چند :- اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ جو کام کرنا چاہتے ہیں اسے میں پہلے ہی کر رہا ہوں۔

شورانی :- یہ تو کوئی دلیل نہ ہوئی۔

پریم چند نے کہا کہ دلیل کی بات نہیں، وہ بھی مزدوروں کا نالہ کی بھلائی کے لئے آندولن چلا رہے ہیں اور میں بھی قلم سے یہی کچھ کر رہا ہوں۔

ہزاروں، لاکھوں ہندوستانیوں کی طرح پریم چند نے بھی بھول سے یہ سمجھ لیا کہ گاندھی جو کچھ چاہتے ہیں وہ پہلے ہی سے وہی کچھ کر رہے تھے۔ گوشہ عافیت میں منوہر خوش خاں کو قتل کرتا ہے اور پریم چند نہایت جا بیداری سے اس کے فعل کی تائید کرتے ہیں اور اسے بے پروا اور سورا بتاتے ہیں۔ لیکن گاندھی جی نے منوہر کے فعل کی کبھی تائید نہیں کی، بلکہ وہ منوہر کے عمل کو آدھے ہی میں

روکنے کے لئے منظر عام پر آئے تھے۔ کانگریس کے لیڈر بنے تھے
 منورہ کا فعل کوئی انفرادی فعل نہیں تھا، وہ اس طبقے کا فعل
 تھا جو لوٹ کھسوٹ سے اور اپنے افلاس سے عاجز آچکا تھا۔ غوث خاں
 کے بعد اس کا اگلا وار گیان شنکر زیندار، اس کے آقا انگریزوں
 سارے خون چوسنے والے طبقے پر پڑتا تھا۔ جنگ کے بعد عوام کا یہ
 اجتماعی عمل شروع ہو گیا تھا۔ اس عمل کو روکنے کے لئے ہی جلیانوالہ باغ
 کا خون چکاں واقعہ وجود میں آیا۔ لیکن عوام کا جوش گولیوں سے نہیں
 بجھا کرتا۔ اگر ان کے عمل کو قدرتی ڈھنگ سے آگے بڑھنے دیا جاتا تو
 گولیوں سے تب کر سکنے والے عوام نہ صرف انگریزی حکومت کو بلکہ
 ہر قسم کی لوٹ کھسوٹ کو ختم کر کے دم لینے اور پریم خندان کی جس
 عظمت کے قائل تھے وہ دل کے ہنسا خانوں سے ابھر کر سطح پر آ جاتی۔
 سرمایہ دار طبقہ نے بھی عوام کے یہ تیور پہچان لئے تھے اور ان
 سے وہ فطرۃ خوف زدہ تھے۔ اب تک کانگریس کی تحریک کچھ
 بڑھے لکھے لیگوں اور ان کے اپنے طبقے تک محدود تھی محنت کش
 عوام پہلی مرتبہ آنا وہی کی جہدِ جہد میں شامل ہو رہے تھے۔ ان کے
 عمل کو اس حد تک ابھارنا ضروری تھا کہ غیر ملکی حکومت سے مراعات
 حاصل کی جاسکیں سمجھتے ہو سکے، جان کی جگہ گو بند کو گدی پر بٹھایا جاسکے
 لیکن اس عمل کو لوٹ کھسوٹ کے نظام سے اس سماج سے ٹکرانے
 سے روکا جائے

اس خوف اور دور اندیشی کا نام گاندھی ازم ہے، جس کا مقصد جائیداد کی حفاظت اور صاحب جائیداد طبقہ کی حفاظت ہے۔ گویا گاندھی ازم وہ درخت ہے جس کی جڑ جائیداد کا تحفظ ہے۔ "رام راج"، "ٹرسٹی شپ"، "ہر دیہ پریورٹن"، "سٹیٹ گراہنڈا اور سٹیٹ بمبئی" شاخیں ہیں۔

ملک میں مزدور تحریک اتنی مصبوط نہیں تھی کہ گاندھی ازم کا تجزیہ کر کے اس کے طبقاتی کردار کو سمجھ لیا جاتا۔ درمیانہ طبقہ کے آزادی پسند پر خلوص نوجوانوں نے اس فلسفے کو اپنا لیا، کیونکہ اس کے سامنے جدوجہد کا اور کوئی وسیع پیمانہ گرام نہیں تھا اور پھر گو درمیانہ طبقہ کام کے اعتبار سے مزدور طبقہ کے قریب ہوتا ہے، لیکن سماجی اعتبار سے وہ سرمایہ دار طبقہ کی روایات کو اپناتا ہی، اس کے ذہن میں بھی جائیداد اور وراثت کے تحفظ کا جذبہ موجود رہتا ہے۔

پریم چند بھی درمیانہ طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کی بھی گاؤں میں جڑی زمین تھی، موردنی گھر تھا، اور انھیں "گھر" سے وہی انس تھا جو درمیانہ طبقہ کے لوگوں کو ملتا ہے۔ اس انس کے کارن وہ بار بار دیہات لیٹ جانے کی خواہش کرتے رہے۔ آخر میں وہ دیہات میں گئے۔ اور بزرگوں کے کچے مکان کی جگہ پتھر کا مکان بنوایا۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ ۱۹۳۳ء کی تحریک میں ہزار خواہش کے باوجود جیل نہیں جاسکے یہی سوچتے رہے کہ شورانی چلی گئیں، اگر وہ بھی چلے گئے تو بچوں کا اور گھر کا خیال کون رکھے گا؟

ستیگرہ کی لڑائی اسی طرح لڑی جاتی تھی کہ گھر بھی بنا رہے اور جیل یا تڑا بھی ہو جائے اور بڑے آدمی جب جیل جاتے تھے تو ان کا کاروبار بدستور چلتا رہتا تھا۔

پریم چند نے زندگی کو کھلاڑی کی طرح گزارنے کا اکثر ذکر کیا ہے۔ یہ کھلاڑی بن کا فلسفہ بھی گاندھی ازم کی ایک شاخ ہے۔ اس نے بہت سے لوگوں کو کھلاڑی بنایا ہے، لیکن ان کے عمل کو چرخے سے باندھے رکھا ہے۔ پریم چند کے امرکانت اور چکر دھر بھی کھلاڑی تھے نہایت خلوص اور ایمان داری سے تحریک میں شامل ہوئے تھے، لیکن آج انھیں ڈھونڈنا ہو تو وہ کانگریس کے بڑے لیڈروں، عہدہ داروں اور وزیروں میں ملیں گے، چونکہ انھوں نے اپنے فعل کا تجزیہ کر کے اس کی خامیوں کو نہیں سمجھا چونکہ وہ انہی کے پیچاری بن کر شکست کو ہی جیت تصور کرتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہیتے ہوتے ریاکاری ان کی زندگی کا جزو بن گئی اور اب وہ اپنی اس ریاکاری سے گاندھی ازم کو محسوس کر رہے ہیں۔

پریم چند کے ہاں بڑا کھلاڑی — گاندھی ہی کا دوسرا روپ ”رنگ بھومی“ کا ہیرو سوراہا ہے جو ایک پیسہ کے لئے تین تین میل دوڑ لگاتا ہے، جو باپ دادا کی میراث — اپنی زمین کی حفاظت کے لئے تن تنہا اور انفرادی ڈھنگ سے لڑتا ہے اور حقیقتوں سے بالکل بے نیاز ہو کر کھلاڑی کی طرح لڑتا ہوا مر جاتا ہے۔ پریم چند

اسے سچا ستیا گری اور آدرش آدمی کہتے ہیں اور اسے پیش کنے میں فن کارانہ جانب داری سے کام لیتے ہیں۔

یہ آدرش جاندار کے تحفظ کا آدرش ہے۔

اپنے مورد فی کردار کو بدنامنا سہل نہیں، بہت مشکل ہے۔ انسان اپنے طبقہ کی بوسیدہ روایات کو جھٹک کر ہزار بار اُگے برٹھتا ہے اور وہ ہزار بار راستہ کاٹ کر اور نیا روپ بھر کر سامنے آجاتی ہیں، پریم چند نے گوشہ عافیت میں جن روایات کا دامن جھٹک دیا تھا بکا بگی ازم کے روپ میں وہ پھر سامنے آ گئیں اور انھوں نے بنا پہچانے انھیں سینے سے لگا لیا۔

یقیناً اس کے بعد جب ستیا گرہ امنسا اور جلد سول سے ان کا بٹھ جاتا ہے اور بھاڑے کے ٹٹو "کہانی کا سیروریش جیل سے رہا ہونے کے بعد جماعتی انقلاب کا اعلان کر دیتا ہے لیکن پھر "کفن" کہانی میں صرف تنقید حیات پر اکتفا کرتے ہیں، کھیت مزدوروں کے عمل کو بالکل نہیں اُبھارتے۔ انھیں صرف چند خدو خدے میں لے جا کر چھوڑ دیتے ہیں۔

سن انتیس تیس میں اور نپتیس، چھتیس تک مزدور تحریک بہت زور پکڑ گئی تھی۔ انھوں نے کانپور، احمد آباد اور بہائی میں بڑی بڑی ہڑتالیں لڑی تھیں، پریم چند ان کا ذکر نہیں کرتے۔ اپنی تخلیقات کو درمیانہ طبقہ تک ہی محدود رکھتے ہیں۔ "گودان" میں مزدوروں کی ہڑتال کا ضمنی سا ذکر ہے، اسے بھی بری طرح کھیل دیا جاتا ہے۔ اور ان کے تشدد

کا انتقام کھنہ کے تل کو اتفاقا آگ لگا کر جذباتی ڈھنگ سے لیا گیا ہے۔ "مل مزدِ ظلم میں سمجھوتہ کیٹی یا صلح کیٹی موجود ہے، اور ڈرائل کا قیدی" کہانی میں مزدوروں کی جدوجہد کے سیلاب کو آواگون کے ریگزار نے جذب کر لیا ہے۔

ان سب باتوں کے باوجود انسانیت دوستی پریم چند کے ادب کی جان ہے۔ وہ کسی طرح لوٹ کھسوٹ، ظلم اور بے انصافی برداشت کرنے کو تیار نہیں جس طرح بہار کے زلزلہ نے ان کے کچے مکان میں دراریں ڈال دی تھیں۔ اسی طرح زندگی کی تلخ اور ٹھوس حقیقتوں نے واقعات کے جھٹکوں نے ان کے گاندھی ازم میں دراریں ہی نہیں شگاف ڈال دیے تھے۔ اس درخت کی شاخیں جھڑ چکی تھیں، صرف جڑ باقی تھی، لیکن گودان میں وہ بھی لوٹتی اور سوز کھتی ہوئی نظر آتی ہے۔ کیونکہ ہوری کسان جس زمین پر جان دیتا ہے اور قلاش میٹے ہیٹے بھی سرمایہ دار طبقہ کی روایات سے چٹیا ہوا ہے آخر اسے کھو کر مزدور بننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

درمیانہ طبقہ کو لوٹ کر مزدور بننے دکھانا گاندھی ازم کی عینیت کے فلسفہ کی شکست ہے اور پریم چند کے ترقی پذیر فن، فلسفہ اور ادب کی فتح بھول نے سمجھ لیا تھا کہ اس لوٹ کھسوٹ کے نظام میں درمیانہ طبقہ کے لئے اپنی جگہ قائم رکھنا ممکن نہیں یہ آئندہ قدم کی واضح سمت ہے۔ اسی سے اُن کے ادب میں تازگی اور نکھار اُڑ رہا تھا۔

شہرت

ہماری زندگی کی سب سے بڑی
 خواہش یہی ہے کہ ہم کہانی بن جائیں
 اور ہماری شہرت ہر طرف بکھر جائے۔ (پریم چند)
 پریم چند کو اپنی زندگی ہی میں کافی شہرت حاصل ہو گئی تھی۔ وہ
 اردو اور ہندی کے بہترین ادیب سمجھے جاتے تھے کوئی دوسرا افسانہ
 نگار ان کے آس پاس بھی نہیں آتا تھا، اردو و ان طبقہ نے انھیں
 "فطرت نگار" اور ہندی والی طبقہ نے "اینیاس سمارٹ"
 کا خطاب دیا تھا۔ ان کی کہانیاں گجراتی، میراثی اور نیگالی وغیرہ
 ملکی زبانوں میں ترجمہ ہوتی ہی تھیں، لیکن اس کے علاوہ انگریزی

اور جاپانی وغیرہ غیر ملکی زبانوں میں بھی کافی کہانیاں ترجمہ ہو چکی تھیں اور ان کی شہرت اب تک پھیل رہی ہے۔ ابھی روسی زبان میں گنڈوان کا ترجمہ ہوا ہے۔

لیکن پریم چند نے شہرت حاصل کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی کیونکہ گوشش سے نہ شہرت حاصل ہوتی ہے اور نہ اس شہرت کا کوئی فائدہ ہی بلکہ اس کا راستہ دوسرا ہے۔ پریم چند لکھتے ہیں: ”اگر ہم سچے دل سے جماعت کی خدمت کریں گے تو اعزاز و امتیاز اور شہرت بھی ہمارے قدم چومے گی۔ پھر اعزاز و امتیاز کی فکر ہمیں کیوں ستائے اور اس کے نہ ملنے سے ہم بالیس کیوں ہوں؟ خدمت میں جو روحانی مسرت ہے وہی ہمارا صلہ ہے۔“

پھر بھی ہر ایک آدمی کے دل میں شہرت کی جو تمنا ہوتی ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟ پریم چند اپنی کہانی ”ادیب کا فرض“ میں اس کی وجہ بیان کرتے ہیں۔ ”ادیب اپنی بیوی سے مخاطب ہے۔“ اب میں لکھیں کیسے سمجھاؤں، ہر ایک شخص کے دل میں عزت اور احترام کی ایک بھوک ہوتی ہے۔ تم بوجھو گی یہ بھوک کیوں ہوتی ہے؟ اس لئے کہ یہ ہمارے روحانی ارتقار کی ایک منزل ہے۔ ہم عالم گیر وسیع عظمت کا ایک جز ہیں جز میں کل کا وصف ہونا لازمی ہے، اس لئے شہرت اور عزت روحانی ترقی اور تعلیم کی طرف ہمارا فطری رجحان ہے۔ میں اس خواہش کو برا نہیں سمجھتا۔“

شہرت کا جذبہ ارتقاء کی خواہش کا اظہار ہے اور وہ تبھی حاصل ہو سکتی ہے جب آدمی زندگی کے مجموعی ارتقاء، تاریخی حقیقتوں کو اگے بڑھانے میں مدد کرے۔ آدمی اپنے انفرادی ارتقاء کو اس طرح نہایت کے مجموعی ارتقاء میں شامل کر دے جس طرح چھوٹے چھوٹے نالے اپنے آپ کو بڑی ندی میں مدغم کر دیتے ہیں اور ندی کا بہاؤ بڑھتا اور پھیلتا جاتا ہے، اور وہ زندگی کو شاداب، زرخیز اور خوش حال بنانے کا کام کرتی ہے۔ یہی عمل، عمل اور یہی قربانی، قربانی ہے۔ جو عمل اور قربانی اس روش سے ہٹ کر کی جاتی ہے اس کا نتیجہ شہرت نہیں بدنامی ہے۔ اور وہ زندگی کے لئے غیر مفید ہے، کیوں کہ اس کا مقصد ارتقاء کو آگے بڑھانے کی بجائے اُسے روکنا ہوتا ہے۔

پریم چند نے یقیناً زندگی کے ارتقاء میں اضافہ کیا ہے دراصل وہ بذات خود ارتقاء کی تحریک تھے۔ جن جن ادب کی ترقی پسند تحریک اپنی روایات کو برقرار رکھتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے اور پھیل رہی ہے ان کی شہرت بھی نمایاں ہوئی اور پھلتی جا رہی ہے

پریم چند کے بعد ترقی پسند ادیبوں نے تنقیدِ حیات کا کام تو بہت کیا ہے، لیکن باعمل اور مثبت کردار بہت ہی کم پیش کئے ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے بعد ترقی پسند تحریک کا قافلہ فریڈ ازم کی پرہیزگار دایلوں میں بٹھک گیا تھا۔ اس سے جس قدر تحریک کی ترقی پسند روایات کو نقصان پہنچا، اسی قدر پریم چند کی شہرت بھی ماند پڑ گئی۔

ہم نے انھیں اصلاح پسند کہہ کر نظر انداز کر دیا۔ اگر پڑھنا پسند نہیں کیا تو کم ضرور کر دیا تھا۔ ہم سمجھتے تھے کہ فرائڈ کے نظریے نے ہمیں تجزیہ نفس کا وہ اصول گوہر عطا کر دیا ہے جس سے پریم چند واقف ہی نہیں تھے اور اس نظریے کی بدولت ہمارا افسانہ ان سے بہت اگے بڑھ گیا ہے۔ لیکن ہم ان کو اور اپنے آپ کو بھلا رہے تھے۔ پریم چند نے فرائڈ ازم کو دیکھا، پرکھا اور مسترد کر دیا۔ وہ اپنی کہانی ”مس پدما“ میں لکھتے ہیں۔

”پدما نے تعلیم سے جو فیض اٹھایا تھا اس میں نفسیاتی خواہشات کی تکمیل ہی حیات کا مقصد تھی۔ بندش روح کی بالیدگی کے لئے زہر تھی۔ فرائڈ اس کا معبود تھا۔ اور فرائڈ کے نظریے اس کی زندگی کے لئے مشعل ہدایت۔ کسی عضو کو باندھ دو، تھوڑے ہی دنوں میں دورانِ خون بند ہو جانے کے باعث بے کار ہو جائے گا۔ فاسد مادہ پیدا کر کے زندگی کو معرض خطر میں ڈال دے گا۔ یہ جنون، مرق اور اختلالِ دماغ کی اتنی کثرت ہے، محض اس لئے کہ خواہشات میں رکاوٹ ڈالا گیا۔ نفسیات کی یہ نئی تینقچ پدما کی زندگی کا مسلمہ اصول تھی۔“

ایک مرتبہ پریم چند اور چندر کمار کے درمیان ادب پر گفتگو ہو رہی تھی۔ گفتگو کا موضوع ٹیگور اور شرٹ چندر تھے۔ گفتگو کا آغاز چندر کے ایک سوال سے ہوا تھا اور وہ چندر ہی کے لفظ

میں یہاں درج کی جاتی ہے ۔
 حنڈرنے کہا :- بنگالی ادب دل کو زیادہ چھوتا ہے ۔ اس سے آپ
 متفق ہیں تو اس کا سبب کیا ہے ؟
 پریم چند نے کہا :- متفق تو ہوں ۔ سبب ، اس میں جنسیت زیادہ ہے
 مجھ میں وہ کافی نہیں ۔

حنڈر ان کی طرف دیکھنے لگے اور پوچھا ۔ جنسیت ہے اس سے
 وہ ادب دل کو زیادہ چھوتا ہے ؟

پریم چند بولے :- ہاں تو وہ جلد جلد REMINISCENT (قابل
 یادداشت) ہو جاتا ہے ۔ یاد میں احساس کی لطافت زیادہ
 ہوتی ہے ۔ غزم میں احساس کی ریاضت ہوتی ہے ۔ تعمیر کے لئے

دونو چاہیں ۔
 کہتے کہتے ان کی آنکھیں حنڈر کو پار کر کہیں دور دیکھنے لگی تھیں
 اس وقت ان آنکھوں کی سُرخمی ایک دم غائب ہو کر ان میں ایک طرح
 کی دور اندیش نیلا ہٹ بھر گئی تھی بولے ”حنڈر مجھے ٹھیک
 نہیں معلوم ۔ میں بنگالی نہیں ہوں ، نہ لوگ تخیل پرست ہیں ، تخیل
 کی پیمناز میں جہاں پہنچ سکتے ہیں ۔ وہاں میری پہنچ نہیں ۔ مجھ میں اتنی
 دین نہیں ؟ گیان سے جہاں نہیں پہنچا جاتا وہاں بھی تخیل سے پہنچا
 جاتا ہے ۔ لیکن حنڈر میں سوچتا ہوں ریاضت بھی چاہئے ، راہنڈر
 اور شرت دونو عظیم ہیں ۔ لیکن ہندی کے لئے کیا بھری راستہ ہے

یا شاید نہیں۔ ہندی راشٹر بھاشا ہے۔ میرے لئے تو یہ راہ نہیں
 ہی ہے۔^۴ (”مہنس“ اکتوبر ۱۹۲۸ء ص ۱)

اسی لئے پریم چند ایسی شاعری کی خصوصاً غزل کو پسند نہیں کرتے
 تھے جو صرف زلفوں کے پیچ و خم میں الجھ کر رہ گئی ہو۔ ایک مرتبہ دیانند
 نگم نے ”زمانہ“ کا آتش نمبر نکالا تھا تو پریم چند اُن پر بہت جھگڑے
 تھے کہ اتنے صفحے بیکار ضائع کئے۔ انھیں وہ ادب پسند نہیں
 تھا جو وقت کے تقاضوں کو پورا نہ کرتا ہو۔ جنسی ادب کو وہ قومی زوال
 کا آئینہ خیال کرتے تھے۔ لکھتے ہیں:-

بے شک شعر و ادب کا منشاء ہمارے احساس کی شدت کو تیز کرنا
 ہے۔ لیکن انسان کی زندگی محض جنس نہیں ہے۔ کیا وہ ادب جس کا موضوع
 جنسی جذبات اور اُن سے پیدا ہونے والے در و یاس تک محدود
 ہوں، یا جس میں دنیا اور دنیا کی مشکلات سے کنارہ کش ہونا ہی زندگی
 کا حاصل سمجھا گیا ہو، ہماری ذہنی اور جذباتی ضرورتوں کو پورا کر سکتا
 ہے۔ جنسیت انسان کا ایک جز ہے اور جس ادب کا بیشتر حصہ اس
 متعلق ہو۔ وہ اس قوم اور اس زمانے کے لئے فخر کا باعث نہیں ہو سکتا۔
 اور نہ اس کے صحیح مذاق ہی کی شہادت دے سکتا ہے۔

(خطبہ صدارت)

ایک طرف ترقی پسند تحریک پر جنسیت کا غلبہ تھا اور ترقی
 پسند ادیبوں نے اپنے درمیانہ طبقہ کے اور بورژوا طبقہ کے جنسی

رجحانات اور کمزوریوں کو بیان کرنا ہی کافی سمجھا، اور مریدوں کسانوں کی تحریک سے کوئی تعلق نہیں رکھا تو دوسری طرف اصلاح پسند اور گاندھی وادی ادیب تھے۔ وہ ترقی پسند تحریک کے ساتھ بھی تھے اور خلاف بھی تھے۔ وہ پریم چند کا جائزہ بھی اپنی ہی فطرت کے مطابق لیتے تھے، اور پریم چند کو ترقی پسند مانتے ہوئے کہ بھی اصلاح پسند اور گاندھی وادی بنا کر پیش کرتے تھے اور ان کے ادیب کے انقلابی کردار کو بالکل نظر انداز کر دیتے تھے۔ ان لوگوں کے کسی ادیب، مفکر اور رہنما کو بڑا بنا کر پیش کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کی شہرت سے ان کے پرانے سماج کو سہارا ملے اور لوگ اس کی ترقی پسند روایات کو بھول کر اسے بے ضرر دیوتا کی طرح پوجتے رہیں۔

ادب کے طبقاتی کردار پر ان کی نظر ہی نہیں جاتی۔ گاندھی ازم تو سیاست کے طبقاتی کردار پر بھی پردہ ڈالتا ہے۔ جو لوگ گاندھی کو اپنے دوزر کا سب سے بڑا ترقی پسند اور انقلابی کہتے ہیں اگر وہ پریم چند کو بھی ترقی پسند کہتے ہیں تو صرف اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں، انھیں انقلاب کی ان محرک قوتوں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، جو ادیب اور انسان کو واقعی ترقی پسند بناتی ہیں جو پریم چند کی تحریروں میں جاری و ساری ہیں۔

دوس کے عظیم فن کار طالتاتی کے ساتھ بھی بد رذو اطمینہ کے ادیبوں نے یہی سلوک کیا تھا۔ طالتاتی نے اپنے نادلوں اور کہتیوں

میں ناز شاہی سماج پر جو نکتہ چینی کی ہے۔ حاکم طبقہ کے مظالم اور
 بے انصافیوں کے خلاف جو آواز بلند کی ہے، غریب کسانوں کی
 انگلیں اور آرزوؤں کو لادے کی طرح اُبلتے ہوئے دکھایا ہے
 اس سے اُنھیں کوئی سرزد کار نہیں۔ وہ تو صرف طاقت کی نام سے
 اپنے آپ کو وابستہ کر کے اپنے سیاسی سرمایہ میں اضافہ کرتے
 رہے۔ صرف لیبنن نے طاقت کے ادب کے انقلابی کردار کو
 پیش کیا اور بتایا کہ کیسے ممکن تھا کہ جب ملک میں اتنی بڑی ہل چل تھی
 تو طاقت نے ایسا سچ مچ بڑا ادیب اس کے کچھ اہم پہلوؤں کو منہ سے
 نہ کرتا۔

اب جبکہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ملک کی سیاست کلطفاً
 کردار ابھر کر لوگوں کے سامنے آگیا ہے اور ادبی تحریک بھی واضح طور پر
 دو کیمپوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔ پریم چند کانٹے شعیر کے ساتھ جائزہ
 لیا جا رہا ہے۔ اس ضمن میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہمارے بعض درست
 پریم چند کی طاقت سے مشابہت دیتے ہیں، اس میں شک نہیں کہ
 جہاں تک کسانوں کی لوٹ کھسوٹ اور حاکم طبقے کے ظلم اور بے انصافی کے
 خلاف احتجاج کرنے کا تعلق ہے۔ دونوں میں مشابہت ہے۔ لیکن دونوں
 میں ایک بڑا فرق ہے جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ فرق یہ ہے کہ طاقت
 شروع سے اصلاح پسند تھے، اور آخر میں بالکل پادری بن گئے
 وہ روسی کسانوں پر ہونے والے ظلم اور دکھ کی کہانیاں بیان کرتے

رہے لیکن جب یہی کسان انقلاب کے لئے تیار ہوئے تو طاقتائے
زمیندارانہ کردار جاگ اٹھا۔ انھوں نے انقلاب سے گھبرا کر چرچ میں بنا
لی، اور مذہب کا پرچار کرنے لگے۔ اُن کی مذہبی رنگ کی کتابیں ہمارے
ہاں گاندھی ازم کا پرچار کرنے کے لئے خوب استعمال ہوئیں اور اب تک
ہو رہی ہیں۔ اس کے برعکس پریم چند مذہب کے قائل نہیں تھے بلکہ مذہب
کو ریاکاری کا زہر سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ قسم کذب کی تائید ہے۔
یہی وجہ ہے کہ اُن کی اصلاح پسندی انقلاب میں تبدیل ہو رہی تھی
آخری عمر میں اصلاح پسندی کے جو تھوڑے بہت عناصر باقی تھے
اُن کے دور ہو جانے کا امکان تھا۔ طاقتائے نادانستہ طور پر
انقلاب کی محرک قوتوں کا عکس پیش کیا ہے۔ پریم چند نے دیدہ دانستہ
انقلاب کی قوتوں کو ابھارا ہے۔ پریم چند کا ارتقار جاری تھا جبکہ
طاقتائے نے آخری عمر میں ارتقار کو جواب دے دیا تھا۔

ملک میں جوں جوں انقلاب کی محرک قوتیں ابھر رہی ہیں، ذہن
صاف ہو رہے ہیں۔ پریم چند کی شہرت اور عظمت بھی ابھر رہی ہے
اور ادب کی ترقی پسند تحریک جس کی انھوں نے داغ بیل ڈالی تھی
بھول بھلیوں سے نکل کر صحیح راہ پر چل پڑی ہے۔

خطبہ صدارت

حضرات! یہ جلسہ ہمارے ادب کی تاریخ میں ایک یادگار واقعہ ہے ہمارے سیمینٹوں اور انجمنوں میں اب تک عام طور پر زبان اور اس کی اشاعت سے بحث کی جاتی رہی ہے۔ یہاں تک کہ اردو اور ہندی کا جو طریقہ موجود ہے اس کا منشاء خیالات اور جذبات پر اثر ڈالنا نہیں بلکہ محض زبان کی تعمیر تھا۔ وہ بھی نہایت ہی اہم کام تھا۔ جب تک زبان ایک مستقل صورت نہ اختیار کر لے اس میں خیالات اور جذبات ادا کرنے کی طاقت ہی کہاں سے آئے۔ ہماری زبان کے بانیوں نے ہندوستانی زبان کی تعمیر کے قوم پر جو احسان کیا ہے اس کے لئے ہم ان کے مشکور نہ ہوں تو یہ ہماری احسان فراموشی ہوگی۔ لیکن زبان ذریعہ ہے منزل

نہیں۔ اب ہماری زبان نے وہ حیثیت اختیار کر لی ہے کہ ہم زبان سے گذر کر اس کے معنی کی طرف بھی متوجہ ہوں اور اس پر غور کریں کہ جس منشاء سے یہ تعمیر شروع کی گئی تھی وہ کیوں کر پورا ہوا، وہی زبان جس میں ابتداء باغ و بہار اور بتیال پچسی کی تصنیف ہی معراج کمال تھی، اب اس قابل ہو گئی ہے کہ علم و حکمت کے مسائل بھی ادا کرے۔

اور یہ جلسہ اس حقیقت کا کھلا ہوا اعتراف ہے۔ زبان بول چال کی بھی ہوتی ہے اور تحریر کی بھی۔ بول چال کی زبان تو میرا من اور لکوال کے زمانے میں بھی موجود تھی۔ انھوں نے جس زبان کی داغ بیل ڈالی وہ تحریر کی زبان تھی اور وہی اب ادب ہے۔ ہم بول چال سے اپنے قریب کے لوگوں سے اپنے خیالات ظاہر کرتے ہیں، اپنی خوشی یا رنج کے جذبات کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ ادیب وہی کام تحریر سے کرتا ہے۔ ہاں اس کے سننے والوں کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے، اور اگر اس کے بیان میں حقیقت اور سچائی ہے تو صدیوں اور قرونوں تک اس کی تحریریں دلوں پر اثر کرتی رہتی ہیں۔ میرا یہ منشاء نہیں کہ جو کچھ سپرد قلم ہو جائے وہ سب کا سب ادب ہے۔ ادب اس تحریر کو کہتے ہیں جس میں حقیقت کا اظہار ہو جس کی زبان سنجہ، شستہ اور لطیف ہو، اور جس میں دل اور دماغ پر اثر ڈالنے کی صفت ہو۔ اور ادب میں یہ صفت کامل طور پر اسی حالت میں پیدا ہوتی ہے جب اس میں زندگی کی حیثیتیں اور تجربے بیان کئے گئے ہوں۔ طلسماتی حکایتوں یا بھوت پریت کے قصوں

یا شہزادوں کے حسن و عشق کی داستانوں سے ہم کسی زمانے میں متاثر ہوئے
ہیں لیکن اب ان میں ہمارے لئے بہت کم دلچسپی ہے۔ اس میں کوئی شک
نہیں کہ فطرت انسانی کا ماہر ادیب شہزادوں کے حسن و عشق اور
طسمانی حکایتوں میں بھی زندگی کی حقیقتیں بیان کر سکتا ہے اور اس میں حسن
کی تخلیق کر سکتا ہے۔ لیکن اس سے بھی اس حقیقت کی تصدیق ہوتی
ہے کہ لٹریچر میں تاثیر پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ زندگی کی حقیقت
کا آئینہ دار ہو، پھر آپ اُسے جس پس منظر میں چاہے رکھ سکتے ہیں۔ چرچے
کی حکایت یا گل و بلبل کی داستان بھی اس کے لئے موزوں ثابت
ہو سکتی ہے۔

ادب کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں لیکن میرے خیال میں اس کی
بہترین تعریف تنقیدِ حیات ہے۔ چاہے وہ مثالوں کی شکل میں ہو یا افکار
کی یا شعری۔ اسے ہماری حیات کا تبصرہ کرنا چاہئے۔ ہم جس دور سے
گزر رہے ہیں اسے حیات سے کوئی بحث نہ تھی۔ ہمارے ادیب تخیلات
کی ایک دنیا بنا کر اس میں من مانے ظلم باندھا کرتے تھے۔ کہیں فسانہ عجیب
کی داستان تھی، کہیں بدستانِ خیال کی اور کہیں چندرکانا سنسنی کی،
ان داستانوں کا منظر محض دل بہلاؤ تھا اور ہمارے جذبہ حیرت کی
تسکین۔ لٹریچر کا زندگی سے کوئی تعلق ہے، اس میں کلام ہی نہ تھا، بلکہ وہ
مسلم تھا۔ قصہ قصہ ہے۔ زندگی زندگی۔ دونوں متضاد چیزیں سمجھی جاتی
تھیں۔ شعرا پر بھی انفرادیت کا رنگ غالب تھا عشق کا معیار نفس پروری

تھا، اور حسن کا دیدہ زیبی۔ انھیں جنسی جذبات کے اظہار میں شعرا اپنی
جدت اور جرات پرانی کے معجزے دکھاتے تھے۔ شعر میں کسی نئی نبارش، یا
نئی تشبیہ یا نئی پرداز کا ہونا داد پانے کے لئے کافی تھا۔ چاہے
وہ حقیقت سے کتنی ہی بعید کیوں نہ ہو۔ یا اس اور درد کی کیفیتیں آسان
اور قفس، برق اور خرمن کے تخیل میں اس خوبی سے دکھائی جاتی تھیں
کہ سننے والے دل تھام لیتے تھے، اور آج بھی وہ شاعری کس قدر
مقبول ہے۔ اسے ہم اور آپ خوب جانتے ہیں۔ بے شک شعرا اور ادب
کا منشاء ہمارے احساس کی شدت کو تیز کرتا ہے۔ لیکن انسان کی زندگی
محض جنسی نہیں ہے، کیا وہ ادب جس کا موضوع جنسی جذبات اور
اُن سے پیدا ہونے والے درد و یاس تک محدود ہو یا جس میں دنیا
اور دنیا کی مشکلات سے کنارہ کش ہونا ہی زندگی کا حاصل سمجھا گیا ہو
ہماری ذہنی اور جذباتی ضرورتوں کو پورا کر سکتا ہے؟ جنسیت انسانیت کا
ایک جزو ہے اور جس ادب کا بیشتر حصہ اسی سے متعلق ہو وہ اس قوم
اور اس زمانے کے لئے فخر کا باعث نہیں ہو سکتا۔ اور نہ اس کے صحیح
مذاق ہی کی شہادت دے سکتا ہے۔ کیا ہندی اور کیا اردو شاعری
دونوں کی ایک ہی کیفیت ہے۔ اس وقت ادب و شاعری کا جو مذاق تھا
اس کے اثر سے بے نیاز ہونا آسان نہ تھا۔ تحسین اور قدر داد دینی کی ہوس
تو ہر ایک کو ہوتی ہے۔ شعرا کے لئے اپنا کلام ہی ذریعہ معاش تھا۔
اور کلام کی قدر دانی رؤسا اور امارت کے علاوہ اور کون کر سکتا۔ ہمارے

شعراء کو عام زندگی کا سامنا کرنے اور اس کی حقیقتوں سے متاثر ہونے کے لئے یا تو موقع ہی نہ تھا یا ہر خاص و عام پر ایسی ذہنی پستی چھائی ہوئی تھی کہ ذہنی اور شعوری زندگی رہ ہی نہ گئی تھی۔ ہم اس وقت کے ادیبوں پر اس کا الزام نہیں رکھ سکتے۔ ادب اپنے زمانے کا عکس ہوتا ہے جو جذبات اور خیالات لوگوں کے دلوں میں جل پیدا کرتے ہیں۔ ذہنی ادب میں بھی اپنا سایہ ڈالتے ہیں۔ ایسی پستی کے زمانے میں یا تو لوگ عاشقی کرتے ہیں یا تصویف اور دیراگ میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس دور کی شاعری اور ادب دونوں اسی قسم کے ہیں، جب ادب پر دنیا کی بے بنیادی غالب ہو اور ایک لفظ یا اس اور شکوہ رزگارا اور معاشقہ میں ڈوبنا ہو اور تو سمجھ لیجئے کہ قوم جمود اور انحطاط کا شکار ہو چکی اور اس میں سعی اور اجتہاد کی قوت باقی نہیں رہی اور اس نے درجاتِ عالیہ کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ اور مشاہدے کی قوت غائب ہو گئی ہے۔

مگر ہمارا ادبی مذاق بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے۔ ادب محض دل بہلاؤ کی چیز نہیں ہے۔ دل بہلاؤ کے سوا اس کا کچھ اور بھی مقصد ہے۔ وہ اب محض عشق و عاشقی کے راگ نہیں الاپتا بلکہ حیات کے مسائل پر غور کرتا ہے۔ ان کا محاکمہ کرتا ہے اور ان کو حل کرتا ہے۔ وہ اب تحریک یا ابہام کے لئے حیرت انگیز واقعات تلاش نہیں کرتا یا قافیہ کے الفاظ کی طرف نہیں جاتا بلکہ اس کو ان مسائل سے دلچسپی ہے جن سے سوسائٹی یا سوسائٹی کے افراد متاثر ہوتے ہیں۔

اس کی فضیلت کا موجودہ معیار جذبات کی قوت شدت ہے جس سے ہمارے جذبات اور خیالات میں حرکت پیدا کرتا ہے۔ اخلاقیات اور ادبیات کی منزل مقصد ایک ہے۔ صرف ان کے طرز خطاب میں فرق ہے۔ اخلاقیات دلیلوں اور نصیحتوں سے عقل اور ذہن کو متاثر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ادب نے اپنے لئے کیفیات اور جذبات کا دائرہ چن لیا ہے، ہم زندگی میں جو کچھ دیکھتے ہیں یا سمجھ کر کچھ لگتی ہے وہی تجربات اور وہی چہل چل میں جا کر تخلیق ادب کی تحریک کرتی ہیں۔ شاعر یا ادیب میں جذبات کی جتنی ہی شدت احساس ہوتی ہے، اتنا ہی اس کا کلام دل کش اور بلند ہوتا ہے جس ادب سے ہمارا ذوق صحیح نہ بیدار ہو، روحانی اور ذہنی تسکین نہ ملے، ہم میں قوت و حرکت نہ پیدا ہو۔ ہمارا جذبہ حسن نہ جاگے جو ہم میں سچا ارادہ اور مشکل پر خراج پائے۔ لہذا استیصال نہ پیدا کرے، وہ آج ہمارے لئے بے کار ہے، اس پر ادب کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ زمانہ قدیم میں مذہب کے ہاتھوں میں سوسائٹی کی لگام تھی۔ انسان کی روحانی اور اخلاقی تہذیب مذہبی احکام پر مبنی تھی اور وہ تخریف یا تحریف سے کام لیتا تھا، عذاب و ثواب کے مسائل اس کے آلہ کار تھے۔ اب ادب نے یہ خدمت اپنے ذمہ لے لی ہے اور اس کا آلہ کار ذوقِ حسن ہے۔ وہ انسان میں اس ذوقِ حسن کو جگانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسا کوئی انسان نہیں جس میں حسن کا احساس نہ ہو۔ ادیب میں

یہ احساس جتنا ہی بیدار اور پر عمل ہوتا ہے اتنی ہی اس کے کلام میں تاثیر ہوتی ہے۔ فطرت کے مشاہدے اور اپنی ذکاوت احساس کے ذریعے اس میں جذبہ حسن کی اتنی تیزی ہو جاتی ہے کہ جو کچھ قبیح ہے غیر مستحسن ہے، انسانیت سے خالی ہے، وہ اس کے لئے ناقابلِ برداشت بن جاتا ہے۔ نیز وہ بیان اور جذبات کی ساری قوت سے دار کرتا ہے۔ یوں کہئے وہ انسانیت کا، علمیت کا شرافت کا علم بردار ہے۔ جو پامال ہیں، مظلیم ہیں، محروم ہیں، چاہے وہ فرد ہوں یا جماعت اُن کی حمایت اور وکالت اس کا فرض ہے۔ اس کی عدالت سوسائٹی ہے۔ اسی عدالت کے سامنے وہ اپنا استغاثہ پیش کرتا ہے اور اس کے احساس حق اور انصاف اور جذبہ حسن کی تالیف کر کے اپنی کوشش کو کامیاب بٹھاتا ہے، مگر عام وکلا کی طرح وہ اپنے مؤکل کی جانب سے جاوید عجلے پیش نہیں کرتا۔ مبالغہ سے کام نہیں لیتا، اختراع نہیں کرتا، وہ جانتا ہے کہ ان ترکیبوں سے وہ سوسائٹی کی عدالت کو متاثر نہیں کر سکتا۔ اس عدالت کی تالیف جی بھی ممکن ہے جب آپ حقیقت سے ذرا بھی منحرف نہ ہوں ورنہ عدالت آپ سے بدظن ہو جائے گی، اور آپ کے خلاف فیصلہ سنا دے گی۔ وہ افسانہ لکھتا ہے مگر واقعیت کے ساتھ، وہ مجسمہ بناتا ہے مگر اس طرح کہ اس میں حرکت بھی ہو اور قوتِ اظہار بھی ہو وہ فطرتِ انسانی کا باریک نظروں سے مشاہدہ کرتا ہے، وہ نفسیات کا مطالعہ

کرتا ہے، اور کوشش کرتا ہے کہ اس کے کیرکٹر ہر حالت میں اور ہر موقع
 پر اس طرح برتاؤ کریں کہ جیسے گوشت پوست کے انسان کرتے ہیں۔
 وہ اپنی طبعی ہمدردی اور حسن پسندی سے زندگی کے اُن نکات پر
 جا پہنچتا ہے جہاں انسان اپنی انسانیت سے معذور ہو جاتا ہے، اور
 واقعہ نگاری کا رجحان یہاں تک رو بہ ترقی ہے کہ آج کا افسانہ
 ممکن حد تک مشاہدے سے باہر نہیں جاتا۔ ہم محض اس خیال سے
 تسکین نہیں پاتے کہ نفسیاتی اعتبار سے یہ سبھی کیرکٹر انسانوں سے
 ملتے جلتے ہیں، بلکہ ہم یہ اطمینان چاہتے ہیں کہ وہ واقعی انسان ہیں۔
 اور مصنف نے حتی الامکان ان کی سوانح عمری لکھی ہے، کیونکہ
 تخیل کے انسان میں ہمارا عقیدہ نہیں ہے، ہم اس کے فعلوں اور
 خیالوں سے متاثر نہیں ہوتے۔ ہیں یہ تحقیق ہو جانا چاہئے کہ مصنف
 نے جو تخلیق کی ہے وہ مشاہدات کی بنا پر ہے یا وہ غماز اپنے کیرکٹر
 کی زبان سے بول رہا ہے۔ اسی لئے ادب کو بعض نقادوں نے،
 مصنف کی نفسیاتی سوانح عمری کہہا ہے۔ ایک ہی واقعہ یا کیفیت
 سے سبھی انسان یکساں طور پر متاثر نہیں ہوتے۔ ہر شخص کی ذہنیت
 اور زاویہ نظر الگ ہے۔ مصنف کا کمال اسی میں ہے کہ وہ جس ذہنیت
 یا زاویہ سے کسی امر کو دیکھے اس میں اس کا پڑھنے والا بھی اس کا ہم خیال
 ہو جائے۔ یہی اس کی کامیابی ہے۔ اسی کے ساتھ ہم ادیب سے
 یہ توقع بھی رکھتے ہیں کہ وہ اپنی بیدار مغزی، اپنی وسعت خیال سے

ہیں بیدار کرے، ہم میں وسعت پیدا کرے، اس کی نگاہ اتنی باریک، اتنی گہری اور اتنی وسیع ہو کہ ہمیں اس کے کلام سے روحانی سرور اور تقویت حاصل ہو۔

بہتر بننے کی تحریک ہر انسان میں موجود ہوتی ہے، ہم میں جو کمزوریاں ہیں وہ کسی مرض کی طرح چھٹی ہوئی ہیں، جیسے جسمانی تندرستی ایک فطری امر ہے اور بیماری بالکل غیر فطری اسی طرح اخلاقی اور ذہنی صحت بھی فطری بات ہے اور ہم ذہنی اور اخلاقی پستی سے اسی طرح مطمئن نہیں ہوتے جیسے کوئی مریض اپنے مرض سے مطمئن نہیں ہوتا ہے۔ جیسے وہ ہمیشہ کسی طبیب کی تلاش میں رہتا ہے۔ اسی طرح ہم بھی اسی فکر میں رہتے ہیں کہ کسی طرح اپنی کمزوریوں کو پرے پھینک کر بہتر انسان بن جائیں۔ اس لئے ہم سادہ اور فقیروں کی جستجو کرتے ہیں، پوجا پاٹ کرتے ہیں۔ بزرگوں کی صحبت میں بیٹھتے ہیں، علماء کی تقریریں سنتے ہیں اور ادب کا مطالعہ کرتے ہیں، اور ہماری ساری کمزوریوں کی ذمہ دار ہمارے بد مزاجی اور محبت کے جذبے سے محروم ہونا ہے۔

جس میں صحیح ذوق حسن ہے، جس میں محبت کی وسعت ہے، وہاں کمزوریاں کیسے رہ سکتی ہیں، محبت ہی تو روحانی غذا ہے، اور ساری کمزوریاں اسی روحانی غذا کے نہ ملنے سے یا مضر غذا کے استعمال سے پیدا ہوئی ہیں آرٹسٹ ہم میں حسن کا احساس پیدا کر دیتا ہے اور محبت کی گرمی اس کا ایک فقرہ ایک لفظ، ایک کنایہ اس طرح ہمارے اندر جا بیٹھتا ہے کہ ہماری روح

خود اس نور سے منور نہ ہوتے ہیں یہ روشنی کیوں کر عطا کر سکتا ہے۔
 سوال یہ ہے کہ حق کیا شے ہے ؟ بظاہر یہ ایک مہل سا سوال
 سوار معلوم ہوتا ہے ، کیونکہ حسن کے متعلق ہمیں کسی قسم کا شبہ نہیں
 ہے۔ ہم نے آفتاب کا طلوع و غروب دیکھا ہے ، شفق کی سُرخ دیکھی ہے
 خوش نما اور خوشنودار پھول دیکھے ہیں ، خوشنوا چڑیاں دیکھی ہیں ، نغمہ
 خواں ندیاں دیکھی ہیں ، ناپختہ ہوئے آبشار دیکھے ہیں۔ ان نظاروں
 میں ہماری روح کیوں کھل اُٹھتی ہے ؟ اس لئے کہ ان میں رنگ با آواز
 کی ہم آہنگی ہے۔ سازوں کی ہم آہنگی ہی سنگیت کی دل کشی کا باعث ہے
 ہماری ترکیب ہی عناصر کے توازن سے ہوتی ہے اور ہماری روح ہمیشہ
 اسی توازن ، اسی ہم آہنگی کی تلاش کرتی ہے۔ ادب آرٹسٹ کے
 روحانی توازن کی ظاہری صورت ہے ، اور ہم آہنگی حسن کی تخلیق کرتی
 ہے ، تخریب نہیں۔ وہ ہم میں وفا اور خلوص اور سہروردی اور انصاف
 اور مسادات کے جذبات کی نشوونما کرتی ہے۔ جہاں یہ جذبات ہیں
 وہیں استحکام ہے۔ زندگی ہے ، جہاں ان کا فقدان ہے ، وہیں آخرت
 خود پردہ ہے اور نفرت اور دشمنی ہے اور موت ہے۔ یہ افتراق غیر فطری
 زندگی کی علامتیں ہیں ، جیسے بیماری غیر فطری زندگی کی ، جہاں فطرت
 سے مناسبت اور توازن ہے ، وہاں تنگ خیالیوں اور خود غرضیوں
 کا وجود کیسے ہو گا۔ جب ہماری روح فطرت کی کھلی ہوئی فضا میں نشوونما
 نہ پاتی ہے تو جانتے نفس کے جراثیم خود بخود ہمارے اندر روشنی سے

مر جتے ہیں۔ فطرت سے الگ ہو کر اپنے کو محدود کرنے سے ہی یہ ساری ذہنی اور جذباتی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ ادب سہاری زندگی کو فطری اور آزاد بناتا ہے یا دوسرے لفظوں میں اسی کی بدولت نفس کی تہذیب ہوتی ہے۔ یہ اس کا مقصد اولیٰ ہے۔

ترقی پسند مصنفین کا عقیدہ ان میرے خیال میں ناقص ہے۔ ادیب یا آرٹسٹ طبعاً اور خلقاً ترقی پسند ہوتا ہے۔ اگر یہ اس کی فطرت نہ ہوتی تو شاید وہ ادیب نہ ہوتا۔ وہ انسٹیبلٹ ہوتا ہے۔ اسے اپنے اندر بھی ایک کمی محسوس ہوتی ہے اور باہر بھی اس کمی کو پورا کرنے کے لئے اس کی روح بے قرار رہتی ہے۔ وہ اپنی تخیل میں فرد اور جماعت کو مسرت اور آزادی کی جس حالت میں دیکھنا چاہتا ہے وہ اُسے نظر نہیں آتی۔ اس لئے موجودہ ذہنی اور اجتماعی حالتوں سے اس کا دل بیزار ہوتا ہے، وہ ان ناخوش گوار حالات کا خاتمہ کر دینا چاہتا ہے تاکہ دنیا مرنے اور جینے کے لئے بہتر جگہ ہو جائے، یہی درد ادیبی جذبہ اس کے دل و دماغ کو سرگرم کار رکھتا ہے۔ اس کا حس دل یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ ایک جماعت کیوں معاشرت در رسوم کی قیود میں پڑ کر اذیت پاتی رہے۔ کیوں نہ وہ اسباب ہیا کئے جائیں کہ وہ غلامی اور مسرت سے آزاد ہو۔ وہ اس درد کو جتنی بے تابی کے ساتھ محسوس کرتا ہے اتنا ہی اس کے کلام میں زور اور خلوص پیدا ہوتا ہے۔ وہ اپنے احساسات کو جس تناسب سے ادا کرتا ہے وہی اس کے

کمال کا راز ہے، مگر شاید اس شخص کی ضرورت اس لئے پڑتی ہے کہ
 ترقی کا مفہوم ہر مصنف کے ذہن میں ایسا نہیں ہے۔ جن خیالات کو
 ایک جماعت ترقی سمجھتی ہے اُنھی کو دوسری جماعت عین زوال سمجھتی ہو
 اس لئے ادیب اپنے آرٹ کو کسی مقصد کے تابع نہیں کرنا چاہتا۔ اس
 کے خیال میں آرٹ صرف جذبات کے اظہار کا نام ہے۔ ان جذبات کو
 فرد یا جماعت پر غور کیا ہی اثر پڑے ترقی کا ہمارا مفہوم وہ صورت
 حالات ہے جس سے ہم میں استحکام اور قوت عمل پیدا ہو۔ جس سے ہمیں
 اپنی خستہ حالی کا احساس ہو۔ ہم دیکھیں کہ ہم کون داخلی اور خارجی اسباب
 کے زیر اثر اس جمود و انحطاط کی حالت کو پہنچ گئے ہیں، اور انہیں دور
 کرنے کی کوشش کریں۔ ہمارے لئے وہ شاعرانہ جذبات بے معنی ہیں،
 جن سے دنیا کی بے ثباتی ہمارے دل پر اور زیادہ مسلط ہو جائے
 جن سے ہمارے دلوں پر مابوسی طاری ہو جائے۔ وہ حسن و عشق کی
 داستانیں جن سے ہمارے رسائل بھرے ہوتے ہیں، ہمارے
 لئے بے معنی ہیں۔ اگر وہ ہم میں حرکت اور حرارت پیدا نہیں کرتے۔ اگر
 ہم نے دوزخوں کے حسن و عشق کی داستان کہہ ڈالی مگر اس سے
 ہمارے ذوقِ جن پر کوئی اثر نہیں پڑا اور پڑا بھی تو صرف اتنا کہ ہم
 ان کی ہجر کی شکلیں پر روئے تو اس سے ہم میں کون سی خدہ سنی یا فونی
 حرکت پیدا ہوئی۔ ان باتوں سے ہمیں کسی زمانے میں وجد آیا ہو مگر
 آج کے لئے وہ بے کار ہیں۔ اس جذباتی آرٹ کا اب زمانہ نہیں رہا۔

اب تو ہمیں اس آرٹ کی ضرورت ہے جس میں عمل کا پیغام ہو۔ اب تو
حضرت اقبال کے ساتھ ہم بھی کہتے ہیں ۛ

رمز حیات جوئی؟ جزد ترپش نیابی
در قلم ارمیدن ننگ است آب جور
بہ آشیان نہ تشنیم ز لذت پرواز
گہے بناخ گلم گاہ بربل جویم

چنانچہ ہمارے مشرب میں داخلیت وہ شے ہے جو جمود پستی سہل
الکاری کی طرف لے جاتی ہے اور ایسا آرٹ ہمارے لئے نہ انفراد حیثیت
سے مفید ہے نہ اجتماعی حیثیت سے مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ
میں اور چیزوں کی طرح آرٹ کو بھی افادیت کی میزان میں تولتا ہوں
بے شک آرٹ کا مقصد ذوق حسن کی تقویت ہے اور وہ ہماری روحانی
مسرت کی کنجی ہے۔ لیکن ایسی کوئی ذوقی معنوی یا روحانی مسرت نہیں ہو
جو اپنا افادی پہلو نہ رکھتی ہو۔ مسرت خود ایک افادی شے ہے اور
ایک ہی چیز سے ہیں افادیت کے اعتبار سے مسرت بھی ہے اور غم بھی
آسمان پر چھائی ہوئی شفق بے شک ایک خوش نا نظارہ ہو، کہیں اساطیر
میں اگر آسمان پر شفق چھا جائے تو وہ ہمارے لئے خوشی کا باعث
نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ وہ اکال کی خبر دیتی ہے۔ اس وقت تو ہم آسمان پر
کالی کالی گھٹائیں دیکھ کر ہی مسرور ہوتے ہیں۔ پھولوں کو دیکھ کر ہم
اس لئے محظوظ ہوتے ہیں کہ ان سے پھل کی اُمید ہوتی ہے۔ فطرت سے

ہم آہنگی اسی لئے ہماری روحانی مسرت کا باعث ہے کہ اس سے ہمیں زندگی میں
نمواد تقویت ملتی ہے۔ فطرت کا قانون نمو اور ارتقا ہے اور جن جذبات
کیفیات یا خیالات سے ہمیں مسرت ہوتی ہے وہ اسی نمو کے معاون ہیں
آرٹسٹ اپنے آرٹ سے حسن کی تخلیق کر کے اسباب اور حالات کو بالیدگی
کے لئے سازگار بناتا ہے۔

مگر حسن بھی اور چیزوں کی طرح مطلق نہیں۔ اس کی حیثیت بھی ضافی
ہے۔ ایک رئیس کے لئے جو چیز مسرت کا باعث ہے وہی دوسرے کے
لئے رنج کا سبب ہو سکتی ہے۔ ایک رئیس اپنے شلفہ شاداب باغچہ میں
بیٹھ کر چڑیوں کے نغمے سنتا ہے تو اسے جنت کی مسرت حاصل ہوتی ہے
لیکن ایک نادار لیکن باخبر انسان اس انارت کے لوازم کو مکروہ ترین
چیز سمجھتا ہے جو غریبوں اور مزدوروں کے خون سے داغ دار رہی ہے
اخوت اور مساوات، تہذیب اور معاشرت اب اسے ہی اکیڈمیٹیل
کا ذریعہ خواب رہی ہے۔ پیشوایانِ دین نے مذہبی، اخلاقی اور روحانی
بندشوں سے اس خواب کو حقیقت بنانے کی متواتر ناکام کوششیں کی
ہیں، ہاتھ بڑھ۔ حضرت عیسیٰ۔ حضرت محمدؐ بھی نبیوں نے اخلاقی بنیاد
پر مسانات کی یہ عمارت کھڑی کرنی چاہی مگر کسی کو پوری کامیابی نہ ہوئی۔ اور
آج اعلیٰ اور لدلی کی تفاوت جتنی بے دردی سے نمایاں ہو رہی ہے
شاید کبھی نہ ہوئی تھی۔

آزمودہ را آزمودن جہل است کے مصلوق اب بھی دھرم اور

اخلاق کا دامن پکڑ کر ہم اس مساوات کی منزل پر پہنچنا چاہیں تو سہیل کا ہی ہوگی۔ کیا ہم اس خواب کو پریشان دماغ کی خلاقی سمجھ کر بھول جائیں؟ تب تو انسان کی ترقی و تکمیل کے لئے کوئی ایڈیل ہی باقی نہ رہ جائے گا اس تو کہیں بہتر ہے انسان کا وجود ہی مٹ جائے۔ جس ایڈیل کو ہم نے تہذیب کے آغاز سے پالا ہے جس کے لئے انسان نے خدا جانے کتنی قربانیاں کی ہیں جس کی تکمیل کے لئے مذاہب کا ظہور ہوا، انسانی معاشرت کی تاریخ اس ایڈیل کی تکمیل کی تاریخ ہے۔ اسے مسئلہ سمجھ کر، ایک نہ مٹنے والی حقیقت سمجھ کر ہمیں ترقی کے میدان میں قدم رکھنا ہے۔ ایک نئے نظام کی تکمیل کنی ہو جہاں وہ مساوات محض اخلاقی بندشوں پر نہ رہ کر قوانین کی صورت اختیار کرے۔

ہمارے لڑکچہ کو اسی ایڈیل کو پیش نظر رکھنا ہے۔ ہمیں حسن کا معیار تبدیل کرنا ہوگا۔ ابھی تک اس کا معیار امیرانہ اور عیش پرورانہ تھا۔ ہمارا مٹا اور اے دامن سے وابستہ رہنا چاہتا تھا۔ انھیں کی قدر دانی پر اس کی ہستی قائم تھی اور انھی کی خشنیدی اور رنجوں، حسرتوں اور تمنائوں، چمکیوں اور قابوئوں کی تشریح و تفسیر اُس کا مقصد تھا۔ اس کی نگاہیں محل سراؤں اور بنگلوں کی طرف اٹھتی تھیں۔ جھبہ بڑے اور کندھ پر اس کے التفات کے قابل نہ تھے۔ انھیں وہ انسانیت کے دامن سے خارج سمجھتا تھا۔ اگر کبھی وہ ان کا ذکر بھی کرتا تو مضحکہ اڑانے کے لئے اس کی دہقانہ وضع اور معاشرت پر ہنسنے کے لئے اس کا "شین" "قاف" درست نہ ہونا یا

محاوروں کا غلط استعمال ظرافت کا ازلی سامان تھا، وہ بھی انسان ہے اس کے بھی دل ہو، اس میں بھی آرزوئیں ہیں۔ یہ آرٹسٹ کے ذہن سے بعید تھا۔ آرٹ نام تھا، اور اب بھی ہے، محدود صورت پرستی کا، الفاظ کی ترکیبوں کی خیالات کی بندشوں کا، اس کے لئے کوئی آرٹسٹیل نہیں ہو۔ زندگی کا کوئی اور بچا مقصد نہیں ہے، بھگتی اور ویراگ تصوف اور دنیا سے کنارہ کشی اس کے بلند ترین تخلیقات ہیں۔ اس کے لئے یہی معراج زندگی ہے۔ اس کی نگاہ بھی اتنی وسیع نہیں ہوئی ہے کہ وہ کش مکش حیات میں حسن کی معراج دیکھے۔ فائدہ دہانی میں بھی حسن کا وجود ہو سکتا ہے۔ اسے شاید وہ تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے لئے حسن عین عورت میں ہے۔ غریب بے حسن عورت میں نہیں جو بچے کو کھیت کی میڈ پر سلائے پید بہا رہی ہے۔ اس نے طے کر لیا ہے کہ رنگے ہونٹوں اور رخساروں اور ابروؤں میں فی الواقع حسن کا لباس ہے، الجھے ہوئے بالوں پٹریاں پڑے ہوئے ہونٹوں اور کھلائے ہوئے رخساروں میں حسن کا گذر کہاں۔ لیکن یہ اس کی تنگ نظری کا قصور ہے۔ اگر اس کی نگاہ حسن میں وسعت آجائے تو وہ دیکھے گا کہ اُن کے ہونٹوں اور رخساروں کی اُڑ میں اگر نخوت اور خد اُڑائی اور بے حسی ہے تو ان مر جھئے ہونٹوں اور کھلائے ہوئے رخساروں کی اُڑ میں ریشہ، اور عقیدت اور مشکل پسندی ہو۔ ہاں اس میں نفاست نہیں کمینیں، لطافت نہیں، ہمارا آرٹ شایاں کشیدائی ہو اور نہیں جانتا شباب سینے پر ہاتھ رکھ کر شعر پڑھنے اور صنف نازک کی کج ادائیگوں کے تسکونے کرنے یا اس کی خود پسندیوں اور چونچلیوں پر سر دھنے میں نہیں ہو

شباب نام ہے آئینہ ملزم کا، بہت کا، مشکل پسندی کا، قربانی کا، اسے تو
اقبال کے ساتھ کہنا ہوگا۔

در درشت جنون من جبریل زبول صیدے

نیروداں بکند آدر، اسے بہت مردانہ

یا

چرمیج سازد جردم ز سبیل بے پردہ است

گماں مبرکہ دریں بحر ساحلے جو تم
اور یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوگی جب ہماری نگاہ حسن عالم گیر ہو جائے
گی جب ساری خلقت اس کے دائرے میں آجائے گی۔ وہ کسی خاص طبقے
تک محدود نہ ہوگا۔ اس کی پرواز کے لئے محض باغ کی چار دیواری نہ ہوگی
بلکہ وہ فضا جو سارے عالم کو گھیرے ہوئے ہے۔ تب ہم بد مزاجی کے
مخل نہ ہوں گے۔ تب ہم اس کی جڑ کھودنے کے لئے سینہ سپر ہو جائیں گے
تب ہم اس معاشرت کو برداشت نہ کر سکیں گے کہ ہزاروں انسان ایک جابر
کی غلامی کریں تب ہماری خود دار انسانیت اس سرمایہ داری اور عسکریت اور
ملوکیت کے خلاف علم بغاوت بلند کرے گی تبھی ہم صرف صفحہ کاغذ پر تخلیق
کر کے خاموش ہو جائیں گے بلکہ اس نظام کی تخلیق کریں گے جو حسن اور مذاق
اور خود داری اور انسانیت کا منافی نہیں ہے۔ ادب کا مشن محض نشاط
اور محفل آرائی اور تفریح نہیں ہے۔ اس کا مرتبہ اتنا نہ گرے۔ وہ وطنیت
اور سیاست کے پیچھے چلنے والی حقیقت نہیں بلکہ ان کے اگلے مشعل دکھاتی

ہوئی چٹنے والی حقیقت ہے۔

ہیں اکثر یہ شکایت ہوتی ہے کہ ادیبوں کے لئے سوسائٹی میں کوئی جگہ نہیں ہے یعنی ہندوستان کے ادیبوں کو مہذب ملکوں میں تو ادیب سوسائٹی کا منفرد رکن ہے اور وزیر اور امرا اس سے ملنا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ مگر ہندوستان تو ابھی تک قرونِ وسطیٰ کی حالت میں پڑا ہوا ہے مگر ادب نے جب امرا کی دروازہ گری کو ذریعہ حیات بنا لیا ہو اور ان تحریکوں اور پھولوں اور انقلابوں سے بے خبر ہو۔ جو سوسائٹی میں ہو رہے ہیں۔ اپنی ہی دنیا بنا کر اس میں روتا اور ہنستا ہو تو اس دنیا میں اس کے لئے جگہ نہ ہونا انصاف سے بعید نہیں ہے۔ جب ادیب کے لئے موزوں طبیعت کے سوا کوئی قید نہیں رہی یا اسی طرح جیسے مہاتما بن کے لئے کسی قسم کی تعلیم کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کی روحانی بلندی ہی کافی ہے تو جیسے مہاتما لوگ در در پھرنے لگے۔ اسی طرح ادیب بھی لاکھوں کی تعداد میں نکل آئے۔ اس میں شک نہیں کہ ادیب پیدا ہوتا ہے، بنایا نہیں جاتا۔ لیکن ہم اگر تعلیم اور طلب سے اس فطری عطیے میں اضافہ اور وسعت پیدا کر سکیں تو یقیناً ہم ادب کی زیادہ خدمت کر سکیں گے۔ اوسط نے بھی اور دوسرے حکماء نے بھی ادیبوں کے لئے سخت شرطیں عاید کی ہیں اور ان کی ذہنی، اخلاقی اور روحانی جذباتی تہذیب اور تربیت کے لئے اصول اور طریقے مقرر کر دئے گئے ہیں۔ مگر آج تو ادیب کے لئے محض ایک رجحان کافی سمجھا جاتا ہے اور بس، اور کسی قسم کی تیاری کی اس کے لئے ضرورت

نہیں۔ وہ سیاسیات، معاشیات یا نفسیات وغیرہ علوم سے بالکل بیگانہ ہو، پھر بھی وہ ادیب ہے۔ حالانکہ ادیب کے سہنے آج کل آئیڈیل رکھا گیا ہے، اس کے مطابق یہ سبھی علوم اس کے جزو خاص بن گئے ہیں۔ اور اس کا رجحان داخلیت یا انفرادیت تک محدود نہیں رہا۔ وہ نفسیاتی اور معاشی ہوتا جاتا ہے۔ وہ اب فرد کو جماعت سے الگ نہیں دیکھتا بلکہ فرد کو جماعت کے ایک حصہ کی شکل میں دیکھتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہ جماعت پر حکومت کرے اُسے اپنی غرض کا آلہ بنائے گویا جماعت میں اور اس میں ازلی دشمنی ہے، بلکہ اس لئے کہ جماعت کی مہنتی کے ساتھ اس کی مہنتی بھی قائم ہے اور جماعت سے الگ وہ صفر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم میں جنہیں بہترین تعلیم اور بہترین ذہنی قوت ملے ہیں ان کے اوپر سماج کی اتنی ہی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے جس طرح سرمایہ دار کو ہم غاصب اور جابر کہتے ہیں اس لئے کہ وہ عوام کی محنت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس طرح ہم اس ذہنی سرمایہ دار کو بھی پرستش کے قابل سمجھیں گے جو سماج کے پیسے اور اونچائی سے اونچی تعلیم پا کر اُسے اپنے ذاتی مفاد کے لئے استعمال کرتا ہے۔ سماج سے ذاتی نفع حاصل کرنا ایسا فعل ہے جسے کوئی ادیب کبھی نہ پسندے گا۔ اس ذہنی سرمایہ دار کا فرض ہے کہ وہ جماعت کے فائدے کو اپنی ذات سے زیادہ فائدہ پہنچانے کی کوشش کرے وہ ادیب کی کسی صنف میں بھی قدم کیوں نہ رکھے اسے اس صنف پر خصوصاً اور عام حالات سے عموماً واقف ہونا چاہیے۔ اگر ہم بین الاقوامی ادیبوں

کی کانفرنسوں کی رپورٹیں پڑھیں تو ہم دیکھیں گے ایسا کوئی معاشی، تاریخی اور نفسیاتی مسئلہ نہیں ہے جس پر اُن میں تبادلہ خیالات نہ ہوتا ہو۔ اس کے برعکس ہم اپنے مبلغِ علم کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اپنی بے علمی پر شرم آتی ہے۔ ہم سمجھ رکھا ہے کہ حاضرِ طبیعت اور رواں قلم ہی ادب کے لئے کافی ہے۔ ہماری ادبی بستی کا باعث یہی خیال ہے۔ ہمیں اپنے ادب کا علمی معیار ادب کا کرنا پڑے گا، تاکہ وہ جماعت کی زیادہ قابلِ قدر خدمت کر سکے۔ تاکہ جماعت میں اُسے وہ درجہ ملے جو اس کا حق ہے تاکہ وہ زندگی کے ہر شعبہ سے بحث کر سکے، اور ہم دوسری زبانوں اور ادبوں کے دستِ خوان کے چھوٹے نوائے ہی کھلنے پر قناعت نہ کریں۔ بلکہ اس میں خود بھی اضافہ کریں۔ ہمیں اپنے مذاق اور طبعی میلان کے مطابق موضوع کا انتخاب کر لینا چاہئے۔ اور موضوع پر عالمانہ عبور حاصل کرنا چاہئے۔ ہم جس اقتصادی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں اس میں یہ کام مشکل ضرور ہے، لیکن ہمارا معیار اٹکا رہنا چاہئے۔ اگر ہم پہاڑ کی چوٹی تک نہ پہنچ سکے تو کم از کم پہنچ ہی جائیں گے جو سطحِ زمین پر پڑے رہنے سے بدرجہا بہتر ہے۔ اگر ہمارا باطنِ محبت سے منور ہو اور خدمت کا معیار ہمارے پیشِ نظر ہو جو اسی محبت کی ظاہر صورت ہے تو ایسی کوئی مشکل نہیں جس پر ہم فتح نہ پاسکیں جنھیں دولت اور ثروت پیاری ہے اُن کے لئے ادب کے مندر میں جگہ نہیں ہے یہاں تو اُن پاسکوں کی ضرورت ہے، جنھوں نے خدمت کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھ لیا ہے، جن کے دل میں تڑپ ہو اور محبت کا جو شش ہو اپنی عزت تو

اپنے ہاتھ ہے۔ اگر ہم سچے دل سے جماعت کی خدمت کریں گے تو اعزاز و امتیاز اور شہرت بھی ہمارے قدم چومے گی۔ پھر اعزاز و امتیاز کی فکر ہمیں کیوں ستائے اور اس کے نہ ملنے سے ہم مایوس کیوں ہوں۔ خدمت میں جو روحانی مسرت ہے وہی ہمارا صلہ ہے۔ ہمیں جماعت پر اپنی حقیقت جاننے کی، اس پر رعب جانے کی ہوس کیوں ہو۔ دوسرے دل سے زیادہ آرام داسا کش سے رہنے کی خواہش ہمیں کیوں ستائے۔ ہم امراء کے طبقہ میں اپنا شمار کیوں کریں ہم تو جماعت کے علم بردار ہیں اور سادہ زندگی کے ساتھ ادنیٰ نگاہ ہماری زندگی کا نصب العین ہے جو شخص سچا آرٹسٹ ہے وہ خود پروری کی زندگی کا عاشق نہیں ہو سکتا۔ اسے اپنے قلب کے اطمینان کے لئے نمائش کی ضرورت نہیں۔ اس سے تو اسے نفرت ہوتی ہے۔ وہ تو اقبال کے ساتھ کہتا ہے۔

مردم آزادم دأں گو نہ غییم کہ مرا
می تیراں کشت بہ یک جام زلال و گراں

ہماری انجمن نے کچھ اسی طرح کے اصولوں کے ساتھ میدان میں قدم رکھا ہے وہ ادب کو سمریات اور شبایات کا درست نگر نہیں دیکھنا چاہتا۔ وہ ادب کو سعی اور عمل کا پیغام اور ترانہ بنانے کا مدعی ہے اسے زبان سے بحث نہیں۔ اکیڈمک کی وسعت کے ساتھ زبان خود بخود سلیس ہو جاتی ہے۔ حسن معنی آرائش سے بے نیاز رہ سکتا ہے جمادیب امراء

کا ہے۔ وہ امر کا طرز بیان اختیار کرتا ہے جو عوام الناس کا ہے وہ
 عوام کی زبان لکھتا ہے۔ ہمارا مدعا ملک میں ایسی فضا پیدا کرنا ہے،
 جس میں مطلوبہ ادب پیدا ہو سکے، اور نشہ زدنا پاسکے۔ ہم چاہتے
 ہیں کہ ادب کے مرکزوں میں ہماری انجمنیں قائم ہوں اور وہاں ادب کے
 تعمیری رجحانات پر باقاعدہ چرچے ہوں، مضامین پڑھے جائیں، مباحثے
 ہوں، تنقیدیں ہوں، جیسی وہ فضا تیار ہوگی جیسی نشاطِ ثانیہ کا
 ظہور ہوگا۔ ہم ہر ایک صوبے میں، ہر ایک زبان میں ایسی انجمنیں کھلانا
 چاہتے ہیں، تاکہ اپنا پیغام ہر ایک زبان میں پہنچائیں۔ یہ سمجھنا غلطی ہوگی
 کہ یہ ہماری ایجاد ہے۔ ملک میں اجتماعی جذبات ادیبوں کے دلوں میں
 موج زن ہیں۔ ہندوستان کی ہر ایک زبان میں اس خیال کی تخم ریزی
 فطرت نے اور حالات روزگار نے پہلے ہی سے کر رکھی ہے۔ جا بجا اس کے
 آنکھیں بھی نکلنے لگے ہیں۔ اس کی آبیاری کرنا اس کے آبیاری کو تقویت
 پہنچانا ہمارا مدعا ہے۔ ہم ادیبوں میں قوتِ عمل کا فقدان ہے۔ یہ ایک
 تلخ حقیقت ہے۔ مگر ہم اس کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے۔ ابھی
 تک ہم نے ادب کا جو معیار اپنے سامنے رکھا تھا اس کے لئے عمل کی ضرورت
 نہ تھی۔ فقدانِ عمل ہی اس کا جو ہر تھا۔ کیوں کہ بسا اوقات عمل اپنے ساتھ
 تنگ نظری اور تعصب بھی لاتا ہے اگر کوئی شخص پارسا ہو کر اپنی پارسانی
 پر غرور کرے اس سے کہیں اچھا ہے کہ وہ پارسانہ ہو کر رند ہو۔ رند کی شفقت
 کی تو گنجائش ہے، پارسانی کے غرور کی تو ہمیں شفاعت نہیں۔ بہر حال

جب تک ادب کا کام تفریح کا سامان پیدا کرنا محض لوریاں گاگنا کر سنانا
محض آنسو بہا کر غم غلط کرنا تھا، اس وقت تک ادیب کے لئے عمل
کی ضرورت نہ تھی، وہ دیوانہ تھا جس کا غم دوسرے کھاتے تھے۔ مگر ہم ادب
کو محض تفریح اور تعیش کی چیز نہیں سمجھتے۔ ہماری کسوٹی پر وہ ادب
کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، احسن کا جوہر ہو۔
تعمیر کی روح ہو۔ زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت اور
ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے سُلکے نہیں کیوں اب اور زیادہ
سونا موت کی علامت ہوگی۔

پریم چند

میں افسانہ کیسے لکھتا ہوں

ایک مرتبہ ایڈیٹر "نیرنگ خیال" لاہور
نے ملک کے مشہور افسانہ نگاروں سے یہ
سوال کیا تھا کہ آپ افسانہ کیوں لکھتے ہیں؟
منشی پریم چند نے اس سوال کے جواب میں
یہ مختصر مضمون تحریر کیا تھا۔

میرے فقے اکثر کسی نہ کسی مشاہدہ یا تجربہ پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس میں میں
ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر محض واقعہ کے اظہار کے
لئے میں کہانیاں نہیں لکھتا۔ میں اس میں کسی فلسفیانہ یا جذباتی حقیقت کا
اظہار کرنا چاہتا ہوں، جب تک اس قسم کی کوئی بنیاد نہیں ملتی۔ میرا قلم ہی

نہیں اٹھتا۔ زمین تیار ہونے پر میں کیرکٹروں کی تخلیق کرتا ہوں۔ بعض اوقات تاریخ کے مطالعہ سے بھی پلاٹ مل جاتے ہیں لیکن کوئی واقعہ افسانہ بننا ہوتا۔ تاوقتیکہ وہ کسی نفسیاتی حقیقت کا اظہار نہ کرے۔

میں جب تک کوئی افسانہ اول سے آخر تک ذہن میں نہ جمالوں لکھنے نہیں بیٹھتا۔ کیرکٹروں کا اختراع اس اعتبار سے کرتا ہوں کہ اس افسانے کے حسب حال ہوں۔ میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ افسانے کی بنیاد کسی پر لطف واقعہ پر رکھوں۔ اگر افسانے میں نفسیاتی کلائیکس موجود ہوں تو خواہ وہ کسی واقعہ سے تعلق رکھتا ہو۔ میں اس کی پروا نہیں کرتا۔ ابھی میں نے ہندی میں ایک افسانہ لکھا ہے جس کا نام ہے ڈل کی رانی۔ میں نے تاریخ اسلام میں تیمور کی زندگی کا ایک واقعہ پڑھا تھا جس میں حمیدہ بیگم سے اس کی شادی کا ذکر ہے، مجھے فیذاً اس تاریخی واقعہ کے ڈرامائی پہلو کا خیال آیا تاریخ میں کلائیکس کیسے پیدا ہو۔ اس کی فکر ہوئی، حمیدہ بیگم نے بچپن میں اپنے باپ سے فن حرب کی تعلیم پائی تھی اور میدانِ جنگ میں کچھ تجربہ بھی حاصل کیا تھا۔ تیمور نے ہزار ہا ترکوں کو قتل کر دیا تھا ایسے دشمن قوم سے ایک ترک عورت کس طرح مانوس ہوئی۔ یہ عقدہ حل ہونے سے کلائیکس نکل آتا تھا۔ تیمور وجہ یہ نہ تھا۔ اس لئے ضرورت ہوئی کہ اس میں ایسے اخلاقی اور جذباتی محاسن پیدا کئے جائیں جو ایک عالی نفس خاتون کو اس کی طرف مائل کر سکیں، اس طرح وہ قصہ تیار ہو گیا۔

کبھی کبھی مٹے سنائے واقعات ایسے ہوتے ہیں کہ ان پر افسانے کی بنیاد آسانی سے رکھی جاسکتی ہے۔ لیکن کوئی واقعہ محض لکھے دارِ حِستِ عبات میں لکھنے اور انشا پر وازانہ کمالات کی بنا پر افسانہ نہیں ہوتا۔ میں ان میں کلائیکیس لازمی چیز سمجھتا ہوں۔ اور وہ بھی نفسیاتی۔ یہ بھی ضروری ہے کہ افسانے کے مدارج اس طرح قائم کئے جائیں کہ کلائیکیس قریب تر آتا جائے۔ جب کوئی ایسا موقع آجاتا ہے، جہاں ذرا طبیعت پر زور ڈال کر ادبی یا شاعرانہ کیفیت پیدا کی جاسکتی ہے تو میں اس موقع سے ضرور فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہوں، ایسی کیفیت افسانہ کی روح ہے۔ میں سست رفتار بھی ہوں، مہینے بھر میں شاید میں نے کبھی دو ہفتوں سے زائد نہیں لکھے بعض اوقات تو مہینوں کوئی افسانہ نہیں لکھتا، واقعہ اور کیرکٹر تو سب مل جاتے ہیں لیکن نفسیاتی بنیاد بمشکل ملتی ہے۔ یہ سکر حل ہو جانے پر افسانہ لکھنے میں دیر نہیں لگتی۔ مگر ان چند سطور سے افسانہ نویسی کے حقائق نہیں بیان کر سکتا۔ یہ ایک ذہنی امر ہے۔ سیکھنے سے بھی لوگ افسانہ نویس بن جاتے ہیں، لیکن شاعری کی طرح اس کے لئے بھی اور ادراک کے ہر شعبہ کے لئے کچھ فطری مناسبت ضروری ہے۔ فطرت آپ سے بلاٹ بناتی ہے، ڈرامائی کیفیت پیدا کرتی ہے، تاثیر لاتی ہے، ادبی خوبیاں جمع کرتی ہے، نادانستہ طور پر آپ ہی سب کچھ ہوتا رہتا ہے ہاں قصہ ختم ہو جانے کے بعد میں خود اسے پڑھتا ہوں۔ اگر اس میں مجھے ندرت، کچھ جدت، کچھ حقیقت کی تازگی، کچھ حرکت پیدا کرنے کی قوت

کا احساس پیدا ہوتا ہے تو میں اُسے کامیاب افسانہ سمجھتا ہوں، ورنہ سمجھتا ہوں فیمل ہو گیا۔ حالانکہ فیمل اور پاس دونوں افسانے شائع ہو جاتے ہیں۔ اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جس افسانے کو میں نے فیمل سمجھا تھا اُسے احباب نے بہت زیادہ پسند کیا۔ اس لئے میں اپنے معیار پر زیادہ اعتبار نہیں کرتا۔

پریم چند

